82

تدبر

زیر نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

82

تدبر

زیر نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

مجلسِ ترتیب :

مولانا امین احسن اصلاحی

خالد مسعود

جاوید احمد

عبداللہ غلام احمد

ماجد خاور

ناشر : ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

مطبع : المطبعۃ العربیہ پرانی انارکلی لاہور

تدبّر

سلسلہ نمبر ۳ — ربیع الثانی ۱۴۰۲ھ — فروری ۱۹۸۲ء

فہرست مضامین

		صفحہ
تذکرہ وتبصرہ		
ادارہ کی پیش رفت	خالد مسعود	۳
تدبر قرآن		
سورۃ بقرۃ (۳)	خالد مسعود	۵
فہم قرآن کے چند بنیادی اصول	امین احسن اصلاحی	۱۳
	عبداللہ غلام احمد	
تدبر حدیث		
موحدین کے لئے وعدۂ جنت	خالد مسعود	۱۹
رجم کی سزا روایات کی روشنی میں	جاوید احمد	۲۷
تزکیۂ نفس		
تعلق باللہ اور اس کی اساسات	امین احسن اصلاحی	۳۷
مراسلہ و مذاکرہ		
فراہی مکتبِ فکر کی بعض خصوصیات	منصور الحمید	۴۳
فقہی اختلافات میں صحیح طرزِ عمل	ماجد خاور	۴۶
جنت کی طمع کے لئے عمل	ماجد خاور	۴۷

تذکرہ وتبصرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ کی پیش رفت

خالد مسعود

تدبر کے پہلے شمارہ میں ہم نے ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے قیام کی ضرورت اور اس کے آغازِ کار کی اطلاع دی تھی۔ تقریباً آٹھ ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین تدبر کو ادارہ کی اس دوران کی کارکردگی سے آگاہ کیا جائے۔ لہٰذا ان صفحات میں ہم ادارہ کی پیش رفت ہی کے بارے میں عرض کریں گے۔

ادارہ تدبر قرآن وحدیث، جیسا کہ قارئین جانتے ہیں، اصلاً ایک علمی وتحقیقی ادارہ ہے جس کے وجود میں آنے کا فوری باعث مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کا یہ عزم ہوا کہ وہ تفسیر تدبر قرآن سے فراغت کے بعد تدبر حدیث کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے ایک ایسے ادارہ کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں جس کے پیش نظر ایسے وسائل فراہم کرنا ہو جن سے قرآن مجید اور حدیث نبوی پر تدبر کی راہ کھلے اور ان لوگوں کے لئے ضروری تعلیم وتدریس کا انتظام کرنا ہو جو ادارہ کے ساتھ وابستہ ہوں۔

ادارہ کے پیش نظر مقصد کی روشنی میں گزشتہ ماہ مئی سے ہفت روزہ درس کے دو سلسلے شروع کر دیئے گئے جن کی تمام تر ذمہ داری مولانا مدظلہٗ نے خود اٹھائی۔ ایک سلسلہ درس ان بنیادی تصورات کی تحقیق پر مشتمل تھا جو ہمارے علمی حلقوں میں قرآن وحدیث کے بابت پائے جاتے ہیں، جن کی صحت پر قرآن وحدیث کے صحیح فہم کا انحصار ہے اور جن میں معمولی سی غلط فہمی کو راہ دینا مزلّۂ قدم ہو سکتا ہے۔ قارئین ان دروس کی نوعیت کا اندازہ اس سلسلہ مضامین سے کر سکیں گے جو 'فہم قرآن کے چند بنیادی اصول' کے عنوان سے تدبر میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ درس نہ صرف قرآن مجید سے متعلق مباحث کے ضمن میں ہوئے بلکہ حدیث وسنت کے مقام اور فہم حدیث کے اصولوں کے تعین کے بارے میں بھی ان میں جامع بحث ہوئی۔ یہ تمام درس ٹیپ کر لئے گئے اور اب ان کو تحریر میں لانے کا کام جاری ہے۔ الحمد للہ کہ چھ ماہ کی مدت میں قرآن وحدیث کے تمام ضروری مباحث پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور یہ ممکن ہوا کہ حدیث کی کوئی کتاب بالاستیعاب پڑھائی جائے۔ چنانچہ مولانا مدظلہٗ نے جنوری سے موطا امام مالکؒ کے درس کا آغاز کیا۔ اس درس میں موطا کی ایک ایک روایت اور اس میں بیان کردہ مسئلہ میں تمام فقہی مسالک کا استنباط

زیر بحث آتا ہے۔ اس طرح یہ درس نہ صرف حدیث بلکہ فقہ کی تدریس کا ذریعہ بھی ہے۔

دوسرا سلسلہ درس جس کا آغاز مئی میں ہوا قرآن مجید کا عمومی و تحقیقی درس تھا جس میں قرآن مجید کے نظام اور اس کی حکمت کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی۔ دسمبر تک قرآن مجید کی آخری اٹھائیس سورتیں زیر درس آئیں۔ جنوری سے قرآن مجید کا سورۃ فاتحہ سے آغاز کر دیا گیا ہے۔ اس درس کے ساتھ مولانا سے استفادہ کا ایک اضافی سامان سامعین کے سوالوں کے وہ جوابات ہیں جو مولانا مدظلہٗ دیتے ہیں اور جن کا نمونہ قارئین تدبر میں مراسلہ و مذاکرہ کے عنوان کے تحت ملاحظہ کر چکے ہیں۔

قرآن و حدیث کا فہم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کا طالب علم عربی زبان سے کما حقہ واقف نہ ہو۔ شرکائے درس کی عربی زبان کی دستگاہ کو بہتر بنانے کے لئے ادارہ نے دو عربی کلاسوں کا اجرا بھی کر دیا ہے۔ ایک کلاس نئے سیکھنے والوں کے لئے ہے اور دوسری ان طلبہ پر مشتمل ہے جو صرف و نحو سے قدرے واقفیت رکھتے ہیں۔

ادارہ کے یہ تمام درس اور کلاسیں ہر جمعرات اور جمعہ کو ۲۱۸، جنزہ بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوتی ہیں۔

ادارہ کے تمام تحقیقی کام تدبر میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں وہ تمام مضامین جن پر مولانا کا نام بطور مصنف شائع ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ کسی مرتب کا نام بھی درج ہوتا ہے، اصلاً مولانا کی تقاریر سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ چونکہ تقریر کا انداز تحریر کے اسلوب سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے اس لئے ان مضامین کو مرتب کرتے وقت کافی حک و اضافہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ کافی محنت کے باوجود اس ترتیب میں بعض تشنہ مضامین بھی آ جاتے ہیں جس کی وجہ سے کہیں کہیں بحث نامکمل نظر آتی ہے۔ اس ممکن خامی کے باوجود ادارہ یہ سمجھتا ہے کہ مولانا مدظلہٗ کے علم سے جس قدر بھی استفادہ ہو سکتا ہے اس کا کوئی موقع رائیگاں نہ جانے دے۔ اگر اس بات کا انتظار کیا جاتا کہ مولانا یہ مباحث خود لکھتے جو اس وقت ان کے رفقا کے قلم سے مرتب ہو رہے ہیں تو شاید جلد ان کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکتی کیونکہ مولانا کے ہاتھ میں تکلیف ہے جس کے باعث قلم ان کی گرفت میں اچھی طرح نہیں آتا۔ ان تمام مضامین کا مطالعہ ان کی تحریر کی اس خاص نوعیت کو ملحوظ رکھ کر کیا جائے۔

تدبر قرآن

خالد مسعود

سورۃ بقرۃ (۳)

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے تمہارا عہد لیا اور اٹھایا تمہارے اوپر طور کو[63] پکڑو اس چیز کو جو ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم خدا کے غضب سے محفوظ رہو ۔ پھر تم نے اس سب کے بعد اعراض کیا[64]، تو اگر تم پر اللہ کی عنایت اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نامرادوں میں سے ہو چکے ہوتے ۔ اور ان لوگوں کا علم تو تمہیں ہے ہی جنہوں نے سبت کے معاملے میں حدود الٰہی کی بے حرمتی[65] کی تو ہم نے ان کو دھتکارا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ[66] تو ہم نے اس کو نمونۂ عبرت بنا دیا ان لوگوں کے لئے جو اس کے آگے اور پیچھے تھے اور اس کو خدا ترسوں کے لئے نصیحت بنایا ۔ ۶۶

---

[63] یہ عہد بنی اسرائیل کے سرداروں سے دامن کوہ میں لیا گیا اور اس وقت ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے جلال کا ایک مظاہرہ تھا تاکہ بنی اسرائیل اس بات کو یاد رکھیں کہ جس خدا کے ساتھ وہ تورات کی پابندی کے لئے شریک معاہدہ ہو رہے ہیں وہ کوئی کمزور اور بے اختیار ہستی نہیں۔

[64] یہ خطاب زمانہ نزول قرآن کے بنی اسرائیل سے ہے درانحالیکہ اعراض ان کے اسلاف سے صادر ہوا تھا۔ اگر اخلاف اگلوں کے مقلد ہوں تو اسلاف کے افعال ان کی طرف بھی منسوب ہوں گے۔

[65] یہ بنی اسرائیل کے نقض عہد کی ایک مثال ہے۔ ان کو سبت (ہفتہ) کے دن کام کاج اور سیر و شکار کی ممانعت تھی لیکن انہوں نے شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لئے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لئے۔ یہاں تک کہ سیر و شکار وغیرہ کی بھی بہت سی راہیں کھول لیں۔ اس آیت میں ان کی اسی قسم کی حرکتوں کی طرف اشارہ ہے۔

[66] یہ لعنت اور پھٹکار کا جملہ ہے۔ بندر کی کسی خواہش اور اس کے فعل کے درمیان اخلاقی حدود و قیود کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ اگر یہی حالت اپنی خواہش نفس کی پیروی میں کسی انسان کی ہو جائے تو اس کے درمیان اور بندر کے درمیان کوئی معنوی فرق نہیں رہ جاتا۔ جب عقلی اور اخلاقی زوال اپنی آخری حد کو پہنچ جاتا ہے تو ان کے درمیان ظاہری فرق بھی بالآخر مٹ ہی کے رہتا ہے۔

[۶۹] اور یاد کرو جب کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو تو وہ بولے کہ کیا تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو[۷۰] اس نے کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے بنوں ۝ انہوں نے کہا اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ گائے کیسی ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا، بیچ راس کی ہو۔ تو کرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے[۷۱] ۝ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ واضح کرے کہ اس کا رنگ کیا ہو؟ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ سنہری ہو، شوخ رنگ، دیکھنے والوں کے لئے دل پسند ۝ بولے اپنے رب سے دعا کرو کہ اچھی طرح واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو، اس لئے کہ گایوں کے امتیاز میں گھپلا ہو رہا ہے، اور انشاء اللہ اب ہم پتہ لگا لیں گے ۝ اس نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے کمیری، زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہ ہو۔ بالکل یکرنگ ہو، اس میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔ بولے، اب تم واضح بات لائے[۷۲] پھر انہوں نے ذبح کی اور وہ ذبح کرتے نظر نہ آتے تھے ۝ ۷۱

---

[۶۹] یہ یہود کے نقضِ عہد کی دوسری مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنیت شروع ہی سے شریعتِ الٰہی کے قبول کرنے کے معاملہ میں کیسی حیلہ جویانہ اور فرار پسندانہ رہی۔

[۷۰] شریعتِ موسوی میں قاتلوں کا سراغ لگانے کے لئے قسامہ کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا یعنی مقامِ قتل کے آس پاس کے سربرآوردہ لوگوں کو جمع کر کے ان سے قسمیں لی جاتیں قسم کو احترام اور تقدیس کا رنگ دینے کے لئے یہ قسم قربان کئے ہوئے جانور پر لی جاتی (استثنا - باب ۲۱) ایک ایسے ہی موقع پر حضرت موسیٰ نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو بنی اسرائیل نے اسے ان کا مذاق سمجھا کہ گائے کی قربانی کا قاتل کے سراغ سے کیا تعلق؟

[۷۱] یعنی حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرو۔ اس قسم کے سوالات کر کے نہ شریعت سے گریز کی راہیں تلاش کرو اور نہ اپنے لئے دین کی وسعتوں کو تنگ کرو۔

[۷۲] اس طرح اپنے لئے گوناگوں قیدیں اور پابندیاں بڑھوا چکنے کے بعد بولے کہ ہاں اب بات اچھی طرح واضح ہوئی۔ اسی طرح کے سوالات کے ذریعہ سے بنی اسرائیل نے اپنے آپ کو شریعتِ الٰہی کی وسعتوں اور رخصتوں سے محروم کر کے اس کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا لیا۔

اور یاد کرو جب کہ تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا۔ پھر اس کے بارے میں ایک دوسرے پر الزام بازی کی[۷۳] حالانکہ اللہ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جو تم چھپاتے رہے ہو ۝ تو ہم نے کہا اس کے ایک جزو سے مارو[۷۴] اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا[۷۵] اور تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھو ۝ پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے[۷۶] پس وہ پتھر کے مانند ہو گئے یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ پتھروں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، بعض پھٹ ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں[۷۷] اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ۝ ۷۴

کیا تم لوگ یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہاری بات مان لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ اللہ کے کلام کو سنتا رہا ہے اور اس کو سمجھ چکنے کے بعد اس کی

---

[۷۳] یہاں سے گائے کے ذبح کے حکم کا اصل مقصد بیان ہو رہا ہے۔ یعنی جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور قاتلوں کا سراغ نہیں لگتا تھا تو قسامہ کے قانون پر عمل درآمد کے لئے یہ حکم دیا گیا۔

[۷۴] یعنی مقتول پر گائے کا خون چھڑکو اور پھر آس پاس والوں سے قسم لو۔

[۷۵] یعنی تمہارے نزدیک تو گائے ذبح کرنے کا حکم ایک مذاق تھا لیکن اگر تم اس قربانی اور قسم میں ایمانداری برتو تو یہی راستہ ہے قاتلوں کے سراغ لگانے اور ان سے قصاص لینے کا جس میں سب کے لئے زندگی ہے۔

[۷۶] معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اس قربانی کا صحیح احترام ملحوظ نہیں رکھا بلکہ جھوٹی قسمیں کھا کر قاتل کو چھپانے کی کوشش کی۔ کسی جرم کے ساتھ جب حیلہ بازی، کٹھ حجتی اور ڈھٹائی بھی شامل ہو جائے تو ایسے مجرموں کے دل خدا کے قانون کے مطابق سخت ہو جایا کرتے ہیں۔

[۷۷] پتھروں کی سختی ان کو ان کی فطری صلاحیتوں سے محروم نہیں کرتی۔ خود بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹتے اور طور کے ایک حصہ کو تجلی الٰہی سے پاش پاش ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے برعکس انسان اگر اپنے آپ کو بگاڑتا ہے تو اس کا بگاڑ آہستہ آہستہ ان تمام صلاحیتوں سے اس کو محروم کر دیتا ہے جو فطرت کی طرف سے اسے ودیعت ہوئی ہوتی ہیں۔

تحریف[88] کرتا رہا ہے اور وہ جانتے ہیں ۞ اور جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم ان کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں کہ وہ تمہارے رب کے پاس تم سے حجت کریں[89] کیا تم سمجھتے نہیں ۞ کیا انہیں نہیں معلوم ہے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں ۞ ۷۷

اور ان میں اَن پڑھ ہیں جو کتابِ الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں[90] ۞ پس بلا کی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے شریعت تصنیف کرتے ہیں پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے[91] تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ پس ان کے لئے بلا کی ہے اس چیز کے سبب سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی اور ان کے لئے بلا کی ہے اس چیز کے سبب سے جو وہ کماتے ہیں ۞ اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ پوچھو کیا تم نے اللہ کے پاس اس کے لیے کوئی عہد کرا لیا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک ایسی تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمہیں کچھ علم نہیں ۞ البتہ جس نے کمائی کوئی بدی اور اس کے گناہ نے

---

[88] تحریف کے معنی بات کو بدل دینے کے ہیں۔ اس بدل دینے کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں مثلاً قائل کے منشا کے خلاف بات کی تاویل کرنا، کسی لفظ کے طرزِ ادا کو بدل دینا، عبارت میں کمی بیشی کر کے اصل مدعا کو خبط کرنا، کسی ذو معانی لفظ کا ترجمہ سیاق و سباق کے خلاف کر لینا، کسی واضح بات کو مبہم بنا دینا وغیرہ۔ اہلِ کتاب تحریف کی ان تمام شکلوں کے مرتکب ہوئے اور یہ تحریف دیدہ دانستہ ہوتی۔

[89] یعنی اظہارِ رواداری کے جوش میں کسی کی زبان سے اسلام کے حق میں کوئی بات نکل جاتی ہے تو اپنی مجلسوں میں یہ اس پر سختی سے گرفت کرتے ہیں کہ تم اس بات کا خیال کیوں نہیں کرتے کہ تمہارے انہی بیانات کو مسلمان قیامت کے دن تمہارے خلاف شہادت اور حجت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

[90] یہ یہود کے ان پڑھ عوام کا بیان ہے کہ یہ اپنی کتاب کی اصل تعلیم سے تو کچھ واقف نہیں البتہ اس کو اپنی تمناؤں اور خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوزخ کی آگ انہیں نہیں چھوئے گی۔ جنت میں یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی نہیں جائے گا، یہود اور نصاریٰ اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، وغیرہ (بقرہ ۸۰، ۹۴، ۱۱۱۔ مائدہ ۱۸)

[91] اس سے مراد وہ فتوے ہیں جو علمائے یہود بغیر کسی شرعی سند کے محض اپنی دنیوی اغراض اور اپنے عوام کو خوش رکھنے کے لئے جاری کرتے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہی اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے۔

اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے[92] ۞ اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے تو وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے[93] ۞ ۸۲

اور یاد کرو[94] جب کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے ۞ والدین کے ساتھ احسان[95] کرو گے۔ قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں کو ان کا حق دو گے اور یہ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو[96] ۞ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ پھر تم برگشتہ ہو گئے مگر تم میں سے بہت تھوڑے لوگ۔ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو[97] ۞ ۸۳

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے اقرار لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے نہ نکالو گے[98]

---

[92] یہ یہود کے واہمہ کی تردید ہے کہ جنت اور دوزخ کا تعلق خاندانی اور گروہی نسبتوں سے نہیں بلکہ تمام تر عمل سے ہے۔ جو شخص کسی برائی کا ارتکاب کرے اور وہ برائی اس کو اپنے گھیرے میں لے لے تو اس کے لئے خلود فی النار ہے، خواہ اس کا تعلق کسی گروہ سے ہو۔

[93] یعنی جو شخص ایمان اور عمل صالح کی روش پر قائم ہے اس کے لئے خلود فی الجنۃ ہے، خواہ اس کا تعلق کسی خاندان سے ہو۔

[94] یہاں سے آگے یہود کے نقضِ عہد کی مزید تفصیل ہے۔

[95] والدین کا یہ حق احسان یعنی حسنِ سلوک کا متقاضی ہے عبادت کا نہیں۔ احسان درحقیقت نام ادائے حقوق کا ہے۔ اگر حقوق ادا نہ کئے جائیں تو محض خالی خولی باتوں سے احسان کا فرض ادا نہیں ہو سکتا۔

[96] یعنی لوگوں کے ساتھ بات شریفانہ انداز میں کی جائے۔ ان کے خلاف دل میں بر ہمی ہو تو اس کو ضبط کیا جائے اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر کی جائے۔

[97] یعنی یہ جرم یہود سے اتفاقی طور پر صادر نہیں ہوا بلکہ اعراض و انحراف ان کے قومی مزاج کی خصوصیت بن چکا ہے اس لئے انہوں نے خدا کے عہد و میثاق کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

[98] یہ عہد بنی اسرائیل سے اس بات کے لئے لیا گیا کہ یہ آپس میں نہ تو ایک دوسرے کا خون بہائیں گے اور نہ اپنے بھائیوں کو ان کے گھروں سے جلا وطن کرنے کی کوشش کریں گے۔

پھر تم نے ان باتوں کا اقرار کیا اور تم اس کے گواہ ہو[99]۔ پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں سے نکالتے ہو۔ پہلے ان کے خلاف حق تلفی اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد کرتے ہو۔ پھر اگر وہ تمہارے پاس قیدی ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ سرے سے ان کا نکالنا ہی تمہارے لئے حرام تھا[100]۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو[101]؟ جو لوگ تم میں سے ایسا کرتے ہیں ان کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں یہ شدید ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی تو نہ تو ان کا عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد ہی پہنچے گی۔ ۸۶

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی[102] تو کیا جب جب آئے گا کوئی رسول تمہارے پاس

---

[99] حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے ہمیشہ من حیث الجماعت آگاہ کرتے اور ان کی اطاعت اور پابندی کا اقرار لیتے تھے۔

[100] بنی اسرائیل کی تاریخ میں یہودیہ اور اسرائیل کی سلطنتوں کے درمیان حریفانہ کاوشیں رہتیں۔ وہ ایک دوسری سے انتقام لینے کے لئے مخالف طاقتوں سے حریف پر چڑھائی کرا دیتے اور جب وہ دشمنوں کے ہاتھوں اسیر ہو کر طالب مدد ہوتے تو ان کو چھڑا کر قومی ہمدردی کی دھونس بھی جماتے۔ نزول قرآن کے زمانہ کے یہود قبائل میں بنو قینقاع اور بنو نضیر خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ اوس کے۔ اوس و خزرج کی جنگوں میں ان کا کردار بھی بالکل یہی تھا جو یہاں بیان ہوا۔

[101] یعنی کتاب الٰہی کی جو بات اپنی خواہشات کے مطابق ہو وہ تو مانی جائے اور جو بات خواہشات کے خلاف ہو اس کا انکار کیا جائے۔ یہ صریح منافقت ہے۔

[102] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات کو یہود نے تائید ربانی اور فیض روح القدس کا نتیجہ قرار دینے کے بجائے نعوذ باللہ شیطانی تصرف کا نتیجہ قرار دیا (متی باب ۱۲) قرآن نے یہ اسی الزام کی تردید کی ہے۔ روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے۔ یعنی جبرئیل علیہ السلام۔

وہ باتیں لے کر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔ ۸۷ اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل تو بند ہیں[103] بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کر دی ہے[104] تو شاذ و نادر ہی وہ ایمان لائیں گے۔ ۸۸

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے[105]، تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ ۸۹ کیا ہی بری ہے وہ چیز جس سے انہوں نے اپنی جانوں کا مبادلہ کیا کہ وہ انکار کر رہے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے اتاری ہے، محض اس ضد کی بنا پر کہ اللہ نازل کرے اپنا فضل جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے[106] پس وہ اللہ کا غضب در غضب لے کر لوٹے[107] اور منکروں کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۹۰

---

[103] یہ قول انداز تکبر کے لئے ہے یعنی ہمارے دل و دماغ لایعنی باتوں کے لئے نہیں بنے ہیں اسی وجہ سے یہ کسی طرح بھی ہمارے دلوں میں نہیں دھنستی ہیں۔ اگر ان میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو معقول باتوں کے قبول کرنے کے معاملہ میں ہم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے؟

[104] یعنی یہ باتیں تو نہایت معقول اور دل نشیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی لعنت کے باعث ان کے دلوں میں ان کے قبول کرنے کے لئے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔

[105] قرآن اور نبی آخر الزماںؐ کی پیشینگوئیاں یہود کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ ان کو امید تھی کہ جب اس نبی موعود کی بعثت ہو گی تو ان کی بدبختی کے دن دور ہو جائیں گے اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کو ان کے تمام دشمنوں پر فتح دے گا۔ اس فتح کے لئے وہ دعائیں کرتے رہتے تھے۔

[106] یہود نے آخری نبیؐ پر ایمان لانے کے بجائے اس کے انکار اور اس کی مخالفت کی راہ اختیار کی۔ ان کو اللہ تعالیٰ پر یہ غصہ تھا کہ اس نے آخری رسول کی نعمت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا خود ان کے اندر سے کسی کو رسول کیوں نہیں بنایا۔

[107] یعنی جہاں سے ان کو سب سے بڑی رحمت لے کر لوٹنا تھا وہاں سے یہ اپنی شامت اعمال کے باعث خدا کا غضب لے کر لوٹے۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ اس چیز پر تو ہم ایمان رکھتے ہی ہیں جو ہم پر اُتری ہے اور وہ اس کے علاوہ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ وہی حق ہے اور مطابق ہے ان پیشینگوئیوں کے جو ان کے ہاں موجود ہیں[۱۰۸]۔ ان سے پوچھو پھر تم خدا کے پیغمبروں کو اس سے پہلے کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم مومن ہو؟ اور موسیٰ تمہارے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے بنے[۱۰۹] ۹۲

اور یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے اوپر طور کو اٹھایا اور حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو اور مانو۔ انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی[۱۱۰] اور ان کے کفر کے سبب سے بچھڑے کی پرستش ان کے دلوں میں رچ بس گئی۔ ان سے کہو کہ اگر تم مومن ہو تو کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کا تمہارا ایمان تم کو حکم دے رہا ہے۔ ۹۳

ان سے کہو کہ اگر دارِ آخرت کی کامیابیاں اللہ کے ہاں دوسروں کے بالمقابل تمہارے ہی لئے مخصوص ہیں تو موت کی آرزو کرو[۱۱۱] اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو؟ مگر یہ اپنی ان کرتوتوں کی وجہ سے جن کے یہ مرتکب ہوتے ہیں کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے[۱۱۲] اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے؟ ۹۵

---

[۱۰۸] یعنی تورات کے بعد وہ کسی چیز پر ایمان لانے کے قائل نہیں حالانکہ تورات کی اپنی پیشینگوئیوں کے مطابق بھی صحیفۂ حق قرآن ہے۔

[۱۰۹] تورات پر یہود کے ایمان کا حال یہ رہا ہے کہ انہوں نے عین موسیٰؑ کی موجودگی میں گوسالہ پرستی کی اور بعد کے زمانوں میں یہ اللہ کے نبیوں کی تکذیب بھی کرتے رہے اور ان میں سے بعض کو انہوں نے قتل بھی کر دیا۔

[۱۱۰] یہ ان کے عمل کی تعبیر ہے جسے قرآن نے ان کے قول کی جگہ رکھ دیا ہے۔ گویا انہوں نے شروع ہی میں اقرار اطاعت کا نہیں بلکہ نافرمانی کا کیا تھا۔

[۱۱۱] یہود آخرت کی نعمتوں کا حقدار بھی تنہا اپنے ہی کو سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہونا چاہیئے کہ تمہیں لقائے رب کا شوق ہو اور تم اس کے لئے موت کی آرزوئیں کرو۔ اللہ سے محبت کرنے والے موت سے بھاگتے نہیں بلکہ وہ اللہ کی راہ میں موت کی تمنا کرتے ہیں۔

[۱۱۲] جو چیز انسان کو موت سے ڈراتی ہے وہ درحقیقت گناہ اور خدا سے بغاوت کی زندگی ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

امین احسن اصلاحی

فہم قرآن کے چند بنیادی اصول
(۲)

۲۔ قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے

فہم قرآن کے لئے دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن مجید جس کو فصاحت و بلاغت کا معجزہ قرار دیا جاتا ہے اور فی الواقع معجزہ ہے بھی، ایک بڑے گروہ کے نزدیک نظم سے بالکل خالی کتاب ہے۔ ان کے نزدیک نہ ایک سورہ کا دوسری سورہ سے کوئی ربط و تعلق ہے، نہ ایک سورہ کی مختلف آیات ہی میں باہم کوئی مناسبت و موافقت ہے۔ ان کے خیال میں یوں ہی کیف ما اتفق ایک سورہ کے بعد دوسری سورہ اور دوسری سورہ کے بعد تیسری سورہ نقل کر دی گئی ہے، ان کی ترتیب کو بدلا بھی جا سکتا ہے، یہ آگے پیچھے بھی ہو سکتی ہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسا فضول خیال ایک ایسی عظیم کتاب کے متعلق لوگوں کے اندر کس طرح جاگزیں ہو گیا ہے جس کے متعلق دوست دشمن دونوں ہی کو اعتراف ہے کہ اس نے دنیا میں ہلچل پیدا کر دی، اذہان و قلوب بدل ڈالے، فکر و عمل کی نئی بنیادیں استوار کیں اور انسانیت کو ایک نیا جلوہ دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی تمام ترتیب شروع سے لے کر آخر تک خواہ وہ آیات کی آیات کے ساتھ یا سورتوں کی سورتوں کے ساتھ یا گروپوں کی گروپوں کے ساتھ ہو، تمام تر توقیفی ہے۔ "توقیفی" ایک اصطلاح ہے جس سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جبریل امینؑ کے واسطے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت کاتبین وحی کے ذریعے انجام پائی ہے اور اس ترتیب عظیم کی نگرانی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا فرض ادا کیا، خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا فرض ادا کیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

نے اپنا فرض مکمل طریقے پر ادا کیا تاکہ امت کی طرف سے سبکدوش ہو جائیں۔

اب اگر اس قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ قرآن مجید کی اصل ترتیب کیا ہے ؟ اس کا نظام کیا ہے ؟ فلاں صاحب کے مصحف میں یہ یہ سورتیں کیوں نہ تھیں اور فلاں صاحب کے مصحف میں اس سورہ کے بعد فلاں سورہ یا اس آیت کے بعد یہ آیت کیوں تھی تو اس قسم کے سوالات بے خبری پر مبنی ہیں۔ جب یہ واقعہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کے متعلق جب وہ نازل ہوئی تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ اس آیت کو فلاں سورہ میں فلاں آیت سے پہلے اور فلاں آیت کے بعد رکھو تو ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اتفاقی نہیں ہو گی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ایماء کے مطابق ہو گی۔ نزول قرآن کے زمانہ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ قرآن مجید کی ایک کاپی چھاپ کر سب جگہ پھیلا دی جاتی۔ اس زمانے میں لوگوں نے اپنے اپنے نسخے رکھے تھے جس کو جو سورہ ملتی اور جہاں موقعہ پاتا وہیں اسے لکھ لیتا۔ البتہ ان نسخوں کے علاوہ ایک سرکاری نسخہ بھی تھا جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتبین وحی سے باقاعدہ لکھوایا تھا اور جس کی ترتیب وہی تھی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ ہر رمضان المبارک میں جبریل امین جس قدر قرآن مجید نازل ہو چکا ہوتا اس کا مذاکرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے۔ جس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس سال آخری رمضان المبارک میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ ہوا۔ پورے قرآن مجید کی ترتیب کے لئے یہ سرکاری اہتمام تھا۔ قرآن مجید کی اس ترتیب کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ قیامہ میں فرمایا ہے :۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (القیمہ ۔ ۱۷-۱۹)	ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا تو جب ہم اس کو سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت کرنا۔

ظاہر ہے کہ جس ترتیب کا اہتمام اس درجہ کا ہوا ہو، اس کے رموز، اس کے حقائق، اس کا فلسفہ، اس کے اسرار، اس کے نکات، اس کے دقائق اور اس کے معارف کی کوئی حد ہی نہیں ہو سکتی۔ اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ترتیب منصوص بھی ہے۔ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ (حجر ۔ ۸۷)	اور ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کئے۔

سات مثانی سے مراد خود قرآن مجید ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دوسری جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ پورا قرآن مثانی ہے فرمایا :۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ (زمر ۔ ۲۳)	اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے، کتاب باہم دگر مشابہ، جوڑے جوڑے۔

مثانی 'مثنیٰ' کی جمع ہے۔ 'مثنیٰ' اس چیز کو کہتے ہیں جو دو دو کر کے ہو، مثنیٰ کا مطلب بار بار دہرائی ہوئی لینا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، لغت سے ثابت نہیں، قرآن میں یہ لفظ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں دو دو کے مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (سبا ۴۶)	یہ کہ اٹھو اللہ کے لئے دو دو کر کے اور ایک ایک کر کے پھر غور کرو۔
.... فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ..... (النساء ۔ ۳)	.... تو عورتوں میں سے جو تمہارے لئے جائز ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کر لو......

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید نے کسی خاص سورہ کو مثنیٰ نہیں کہا بلکہ پوری کتاب کو کہا ہے "کتابا متشابہا مثانی" کہ یہ کتاب دو دو کی صورت میں ہے اور اس کے تمام اجزا باہم ہم رنگ اور ہم آہنگ ہیں جن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں پایا جاتا۔

قرآن مجید کی تلاوت اگر غور و تدبر کے ساتھ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔ ہر سورہ اپنا مثنیٰ رکھتی ہے۔ ان دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ ایک میں جو پہلو مخفی ہے دوسری اس کو اجاگر کرتی ہے۔ اگر آپ سورتوں کی اس ترتیب پر ایک نظر ڈالیں جس ترتیب سے وہ مصحف میں ہیں تو یہ چیز بھی آپ کو بالکل صاف نظر آئے گی کہ قرآن مجید میں مکی اور مدنی سورتوں کے ملے جلے سات گروپ بن گئے ہیں جن میں سے ہر گروپ ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر تمام ہوتا ہے ہر گروپ

میں پہلے مکی سورتیں ہیں، ان کے بعد مدنی سورتیں ہیں۔ جب میرے سامنے قرآن عظیم کے یہ ساتوں گروپ آتے ہیں اور ساتھ ہی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے پر نظر پڑتی ہے تو بے ساختہ میرا ذہن ”وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ“ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اسی بنیاد پر میں قرآن عظیم کی ترتیب کو منصوص مانتا ہوں۔

فرض کر لیجئے کہ کوئی صاحب یہ کہتے ہیں کہ فلاں گروپ میں فلاں سورہ کو کسی نے مکی کہا اور کسی نے مدنی کہا تو یہ بات اہمیت نہیں رکھتی۔ کسی سورہ کے مکی اور مدنی ہونے کا تعلق تو تمام تر اس کے مضمون سے ہے۔ میں نے 'تدبر قرآن' میں اچھی طرح سے واضح کر دیا ہے کہ کس طریقہ سے قرآن مجید سات گروپوں میں ہے۔ یہ ساتوں گروپ نہایت محکم ہیں اور ان میں پہلے ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں ہیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زیادہ مدنی آتی ہیں۔ یہ ساتوں گروپ ملتے جلتے بھی ہیں اور ان کے درمیان امتیاز بھی ہے۔ یعنی بعض پہلو سے ایک گروپ دوسرے گروپ سے ممتاز ہے۔ ہر گروپ میں مضامین مختلف اسلوبوں سے دہرائے گئے ہیں۔ کسی میں توحید کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، کسی میں معاد کا اور کسی میں رسالت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی قرآن مجید نے بار بار واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کی باتیں اور اپنی آیات مختلف شکلوں اور گوناگوں پیرایوں میں پیش کی ہیں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت کریں گے تو محسوس کریں گے کہ ایک مضمون ساتوں گروپوں میں بار بار سامنے آیا ہے لیکن وہ ایک ہی طریقہ سے بیان نہیں ہوا بلکہ وہی مضمون مختلف اسلوبوں سے اس طرح بیان ہوا ہے کہ اگر آپ ایک جگہ بات کو نہیں سمجھے تو دوسری جگہ سمجھ جائیں گے اور دوسری جگہ نہیں سمجھے تو تیسری جگہ نہیں تو چوتھی جگہ بات سمجھ میں آ جائے گی اور اس طریقہ سے سمجھ میں آئے گی کہ کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جائے گی۔

اگر فی الواقع قرآن مجید میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کو دوسری آیات سے جوڑنے کے لئے اس درجہ اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ اگر ترتیب محض اتفاقی ہوتی تو بہترین ترتیب تو نزولی ہوتی۔ جس ترتیب سے آیتیں نازل ہوتی تھیں اسی ترتیب سے مصحف میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی نہیں ہے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خاص ہدایات کے تحت خاص خاص آیات کے لئے خاص خاص مواقع معین

کئے گئے ہیں۔ دوسری مناسب ترتیب مقداری ہو سکتی تھی یعنی آیتیں برابر برابر مقدار میں مختلف سورتوں میں جمع کر دی جاتیں لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی اور کتنی ہی چھوٹی سورتیں ایسی ہیں جو اپنے سے بڑی سورتوں پر مقدم ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس ترتیب کے اندر معنوی حکمت نہیں ہے تو یہ ترتیب کیوں اختیار کی گئی؟ غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گروپ میں جو باتیں ہیں وہ پہلے ہی گروپ میں موزوں ہیں اور آخری گروپ میں جو باتیں ہیں وہ آخری گروپ ہی کے لئے موزوں ہیں۔ پہلے گروپ میں قانون و شریعت ہے اور آخری گروپ میں جھنجھوڑ دینے والی سورتیں ہیں۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو ایک عمارت اور اس کی بنیاد میں ہوتا ہے۔ البتہ یہ باتیں سمجھنے کے لئے برسوں کی کاوش درکار ہے۔ جو شخص زندگی کھپائے وہی اس سے کچھ حصہ پا سکتا ہے۔

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب میں نظم کی یہ بات جو آپ کہتے ہیں آپ سے پہلے لوگوں نے یہ نہیں کہی۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس راہ میں پہلا مدعی نہیں ہوں بلکہ بعد میں آنے والوں میں سے ہوں۔ یہ بات تو پہلے بھی کہی گئی ہے لیکن عاقلوں کی بات بہت کم لوگ ہی سنتے اور یاد رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ نظم کی بات پہلی مرتبہ نہیں کہی گئی۔ پہلے بھی کہنے والے تھے جو نظم کی تلاش اور جستجو میں رہتے تھے۔ اس چیز کا دعویٰ سلف میں بہتوں نے کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ رازیؒ قرآن کے نظم کے سب سے زیادہ مدعی تھے اگرچہ جو نظم رازیؒ بیان کرتے ہیں وہ غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہے اس وجہ سے اس سے اطمینان نہیں حاصل ہوتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ کے علاوہ ایسے علماء بھی گزرے ہیں جنہوں نے نظم قرآن کی حکمت پائی، اس کی حلاوت سے آشنا ہوئے اور انہوں نے صاف صاف یہ بھی کہا کہ ہم نے اس علم کے قدردان نہیں پائے۔ یعنی لوگوں نے ان کے علم سے استفادہ نہیں کیا۔ اس وجہ سے ان کا علم ان کے ساتھ ہی رہا۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے علم میں لوگ ہمیشہ ایک درجے کے نہیں رہے ہیں بلکہ مختلف درجات کے لوگ رہے ہیں۔ جو درجہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ یا مجاہدؒ یا عکرمہؒ کا ہے وہ درجہ ہر کسی کا تو نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کے نظم اور ترتیب کی حکمت، غور، تدبر اور محنت سے تعلق رکھتی ہے لیکن محنت شاقہ جو علم اور حقیقت رسی کے لئے مطلوب ہے اگر [illegible] اول پڑھنے میں صرف ہونے لگے تو فکر و فلسفہ پر کون سر کھپائے گا اور اگر حال یہ ہو کہ کسی کتاب میں لکھے ہوئے مسائل کو جان لینا کافی سمجھ لیا جائے تو

اس کی حکمت کے جواہر ریزے تلاش کرنے میں سرگرداں ہونے کی مشقت کون برداشت کرے گا؟

اس زمانے میں لوگوں میں نئے نئے شوق ابھر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں آخرکار یہ فتنہ بھی پیدا ہوگیا ہے کہ مستشرقین قرآن مجید کے ایسے نسخے چھاپ رہے ہیں۔ جن میں ان کے نزدیک قرآن کی ترتیب سائنٹفک کردی گئی ہے۔ مسلمانوں کے اندر کے بعض زعما تک کا حال یہ ہے کہ وہ اس حرکت میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی جو ترتیب قائم کی ہے اس کے متعلق لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ اس پر غور و تدبر کرنا ایک غیر ضروری کاوش اور کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔

میرے نزدیک، جیسا کہ اوپر دلائل سے واضح کیا گیا، قرآن مجید کی موجودہ ترتیب نہ صرف توقیفی ہے بلکہ منصوص بھی ہے۔ اس کی حفاظت ایک شرعی امر ہے۔ جو لوگ اس کی ترتیب کو الٹنا پلٹنا چاہتے ہیں وہ قرآن مجید کی حرمت کو ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ امت کا فرض ہے کہ وہ اس فتنہ سے ہوشیار رہے، ترتیب قرآن کی حفاظت کرے۔ قرآن مجید کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے سر کی بازی بھی کھیلنی پڑے تو اس جہاد کے لئے تیار رہے اور اس ترتیب کے فکر و فلسفے پر غور کرے تاکہ اس کتاب مجید کی حکمتوں سے ناآشنا اور محروم نہ رہے۔

بقیہ : سورۃ بقرۃ

اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے، ان لوگوں سے بھی زیادہ جنہوں نے شرک کیا ہے[113] ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اس کو ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر یہ عمر بھی ان کو ملے تو بھی وہ اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے والے نہیں بن سکتے اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں[114] ۝ ۹۶

---

[113] یعنی کتاب و شریعت کے نہایت بلند بانگ دعاوی کے باوجود عقیدہ اور عمل دونوں ہی اعتبارات سے یہ یہود مشرکین سے بھی گئے گزرے ہیں۔

[114] آیات ۸۳ تا ۹۶ میں یہود کے نقض عہد کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی قرآن کی مخالفت صرف قومی نخوت، ہٹ دھرمی اور حسد پر مبنی ہے۔ باقی آئندہ ۔ ترتیب: عبد اللہ غلام احمد

تدبر حدیث

خالد مسعود

موحّدین کے لئے وعدۂ جنت

عن عثمان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مات وھو یعلم انہٗ لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔

حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ مانتا ہوا مرا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہوگیا۔

(مسلم، کتاب الایمان، باب من لقی اللہ بالایمان)

وضاحت حدیث عَلِمَ یَعْلَمُ کے سادہ معنی تو جاننے کے ہیں لیکن عربی زبان میں الفاظ کبھی اپنے بالکل ابتدائی اور سادہ مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں اور کبھی اپنے انتہائی اور کامل مفہوم میں۔ چنانچہ یہ لفظ بھی جب اپنے کامل مفہوم میں آتا ہے تو اس سے مراد وہ جاننا ہوتا ہے جو پورے یقین و اذعان اور عزم و جزم کے ساتھ ہو۔ اس معنی کی تائید قرآن مجید میں اس لفظ کے بعض استعمالات سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۹ میں ایک پیغمبر کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ ان کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو برباد ہو چکی تھی۔ انہیں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ خداوند نے ان کو اپنی قدرت کا مشاہدہ کرانے کے لئے سو سال تک کے لئے ان پر موت طاری کردی۔ جب ان کو اٹھایا تو ان کا سواری کا گدھا ہڈیوں کا پنجر بن چکا تھا۔ خداوند نے ان کے دیکھتے اس پنجر کی ہڈیوں کو پھر سے جوڑا اور ان پر گوشت چڑھا کر گدھے کو نئی زندگی دے دی۔ اس موقع پر جب ان پیغمبر کو عین الیقین حاصل ہوا تو وہ پکار اٹھے اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (میں مان گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے) ظاہر ہے کہ خدا کی قدرت کا اتنا بڑا مظاہرہ دیکھ کر وہ یہ کمزور جملہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ مجھے معلوم ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ انہوں نے اگر کہا تو یہ کہا کہ میرے دل سے شک کا کانٹا نکل گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا اَعْلَمُ یہاں اپنے انتہائی اور کامل

معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے آسمانی دسترخوان کے نزول کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا (۱۱۳ مائدہ) یہاں بھی نَعْلَمَ اپنے کامل معنی میں ہے گویا حواریوں نے درخواست کی کہ ہمیں آسمان سے دسترخوان نازل کر کے ایک معجزہ دکھا دیا جائے تاکہ ہمیں پوری طرح یقین و اذعان حاصل ہو جائے کہ آپ نے ہم سے سچا وعدہ کیا۔

زیر بحث حدیث میں بھی یَعْلَمُ کا لفظ ہمارے نزدیک اپنے کامل مفہوم میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ بندۂ مومن کے دل میں اس حقیقت کے بارے میں شک کا کوئی کانٹا نہ ہو بلکہ اسے پورا یقینؔ ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

من مات وھو یعلم میں مرنے والے کی حالت کا بیان ہے یعنی "جو شخص یہ یقین رکھتا ہوا مرا کہ ....." یہ حالت تقاضا کرتی ہے کہ مرنے والے کی یہ کیفیت مرنے سے پہلے کی زندگی میں بھی رہی ہو اور اسے موت آئے تو اسی ایمان ویقین کی حالت میں آئے۔ یعنی وہ زندگی گزارے تو کلمہ توحید پر قائم رہ کر اور اس کا خاتمہ ہو تو وہ بھی اسی کلمہ پر۔ یہ سعادت ظاہر ہے کہ موت کو دیکھ کر ایمان لانے والے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس کا ایمان مقبول نہیں ہوتا۔ یہ اس شخص کو حاصل ہوتی ہے جو ہر لمحہ اور ہر آن خدا کی توحید کا استحضار رکھے اور لا الہ الا اللہ کی حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اگر دل و دماغ پر غفلت کو طاری ہونے کا موقع دیا جائے تو کیا معلوم کہ جب بندے پر وقت آخر آئے تو وہ اسی غفلت کی حالت میں ہو اور توحید پر اس کا خاتمہ نہ ہو سکے۔ لہٰذا انبیائے کرام نے اپنے متعلقین کو ہمیشہ یہی نصیحت کی ہے کہ وہ دین توحید کے بارے میں ہوشیار اور محتاط رہیں تاکہ ان کی موت اسلام ہی پر آئے۔ سورہ بقرہ میں خانوادۂ ابراہیم خلیل اللہ کی اسلام کے ساتھ وابستگی کا جہاں ذکر ہوا ہے وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اپنے وقت آخر میں حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲۔ بقرہ)

اللہ نے تمہارے لئے دین توحید کو منتخب کر لیا ہے پس تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔

یہی تلقین اس امت کو کی گئی جب یہ فرمایا کہ

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲۔ آل عمران)

اللہ سے ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت ہرگز نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ ایمان و اسلام پر اپنے خاتمہ کی دعا کیا کرتے تھے۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (۱۰۱۔ یوسف)

مجھے وفات دے اسلام کی حالت میں اور مجھے ملا نیکوں کے ساتھ۔

پس ان تفصیلات کی روشنی میں زیر بحث حدیث کا مفہوم یہ متعین ہوا کہ اگر ایک بندۂ مومن اپنی زندگی کلمۂ توحید کے تقاضوں کے مطابق توحید پر پورے یقین و اعتماد کے ساتھ گزارتے ہوئے اسی حالت میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرے گا تو اس کے لئے آخرت میں جنت کا حتمی وعدہ ہے۔

اس مجمل مفہوم کی کچھ تفصیل ہے جس کے لئے اس مفہوم کی حامل دوسری روایات پر نظر ہونا ضروری ہے۔ یہ روایات کتب حدیث میں بکثرت موجود ہیں لیکن ہم بحث کو مکمل کرنے کے لئے صرف مسلم شریف کی چند روایات پر اکتفا کرتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

نظائر حدیث ۱:۔ حضرت عبادہ بن الصامتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ من شھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ حرم اللہ علیہ النار (جس شخص نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، خدا اس پر آتش دوزخ کو حرام کر دے گا)

اس روایت میں کلمہ توحید کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت کو بھی دوزخ سے براءت کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور یہ بات فلسفہ دین کے مطابق ہے کیونکہ توحید کی اصل حقیقت کو لوگوں پر واضح کرنے والے پیغمبر ہی ہوتے ہیں۔ ان کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر ایک شخص نہ توحید کا فہم حاصل کر سکتا اور نہ اس کے تقاضوں سے واقف ہو سکتا ہے۔

۲:۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران صحابہؓ کا زادِ راہ کم پڑ گیا خوراک کی کمی کے باعث بار برداری کے جانوروں کو ذبح کرنے کی نوبت آگئی۔ اس مرحلہ پر آنحضرتؐ نے تمام شرکائے سفر کو اپنا بچا کھچا زادِ راہ یکجا کرنے کی ہدایت فرمائی۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو آپؐ نے اس

میں برکت کی دعا فرمائی جس کے نتیجہ میں زادِ راہ پورے سفر کے لئے کفایت کر گیا۔ اس معجزہ کے ظہور کے وقت آنحضرتؐ پکار اٹھے اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ و انی رسول اللّٰہ لا یلقی اللہ بھما عبد غیر شاک فیھما الا دخل الجنۃ (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ کوئی بندہ جو یہ دو گواہیاں دیتا ہوا اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ ان کے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہ ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا)

اس روایت میں توحید و رسالت کی گواہی کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے کہ یہ دل کے یقین کے ساتھ ہو، گواہی دینے والا شک میں مبتلا نہ ہو اور اسی پر قائم رہتا ہوا رب سے جا ملے۔ یہ وہی شرط ہے جو زیرِ بحث روایت کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، لیکن وہاں یہ اس طرح نمایاں نہیں جیسی اس روایت میں ہے۔

۳: حضرت عبادہ بن الصامتؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے یہ اقرار کیا کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے جس کا کوئی شریک نہیں، محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں، عیسیٰؑ اللہ کے بندے، اس کی بندی کے بیٹے، اس کا وہ فرمان جو اس نے مریمؑ پر ڈالا اور اس کی جانب سے ایک رُوح ہیں اور یہ کہ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس دروازے میں سے چاہے گا داخل کرے گا۔

اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کے اقرار اور جنت دوزخ پر ایمان کو بھی توحید کی گواہی کے تضمنات کی حیثیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس گواہی پر جنت کا حتمی وعدہ کیا ہے۔

ایک ہی مفہوم کی حامل ان روایات کے الفاظ میں کمی بیشی کا نمایاں اور قوی تر سبب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے یہ کلمات مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے۔ چونکہ ہر جگہ سامعین الگ تھے آپ نے الفاظ کے انتخاب میں سامعین کے علم و فہم، سابقہ معلومات و عقائد، قدامتِ اسلام اور صلاحیتوں کا لحاظ رکھا۔ مثلاً زیرِ بحث روایت میں مخاطب حضرت عثمان غنیؓ جیسے اکابر ہے۔ اس طرح کے مخلص و فاشعار متبعینِ رسول کو یہ بتانا تحصیل حاصل تھا کہ توحید کی شہادت کا ایک لازمہ رسالت کی شہادت بھی ہے اور یہ شہادت پورے شرح صدر کے ساتھ مطلوب ہے نہ کہ شک و شبہ کے ساتھ۔ چنانچہ آنحضرتؐ

نے صرف کلمہ توحید کی شہادت ہی کا تذکرہ فرمایا جب کہ عامۃ المسلمین کے سامنے بات کو زیادہ کھول کر کہا تاکہ ان کے علم میں اضافہ ہو، ان کی تربیت ہو اور ان کی خامیوں کی اصلاح ہو۔

الفاظِ حدیث کے ان فطری اختلافات کے پیشِ نظر اصولی طور پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی بھی روایت کے حقیقی مفہوم کو جاننے کے لئے اس کے لئے اس کے تمام نظائر کو جمع کریں اور ان کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد نتائج اخذ کریں۔ چنانچہ زیرِ بحث روایت کے ظاہر الفاظ سے اگر کوئی شخص یہ فلسفہ قائم کرے کہ ایک مرنے والا اگر یہ جانتا رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو جنتی ہوگا، تو اس کا یہ فلسفہ صحیح نہ ہوگا۔ بلکہ نظائرِ حدیث کی روشنی میں نتیجہ نکالا جائے گا کہ اگر ایک بندۂ مومن دل کے یقین اور ایمان کے ساتھ خدا کی توحید اور اس کے تضمنات نیز رسول اللہ کی رسالت کی شہادت دیتا رہا، اس بارے میں وہ کسی شک و تذبذب میں مبتلا نہیں ہوا اور اسی حالت میں اسے موت آئی تو وہ جنتی ہوگا۔

ایک مغالطہ اور اس کی حقیقت

اس حدیث اور اس کی ہم معنی مجمل رِوایات سے لوگوں نے فی الواقع یہ مطلب نکالا ہے کہ محض کلمہ توحید کا اقرار جنت کے حصول کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مطلب اخذ کرنا قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگر فی الحقیقت یہ بات صحیح ہوتی تو اس طرح کا اقرار تو فرعون نے بھی اس وقت کر لیا جب وہ ڈوبنے لگا اور اسے اپنی موت نظر آنے لگی۔ اس کے باوجود قرآن نے خبر دی ہے کہ وہ آخرت میں دوزخیوں کا پیشرو ہوگا۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں منافقین نہ صرف کلمہ توحید کا اقرار کرتے تھے بلکہ دوسرے دینی کاموں میں حصہ بھی لیتے تھے اس کے باوجود قرآن نے ان کے لئے دوزخ کے انتہائی نچلے طبقے کی سزا کی خبر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ توحید کی محض قولی شہادت کسی شخص کے نیک ہونے کی دلیل نہیں۔

اس نقطۂ نظر کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس میں اور یہود کے اس دعویٰ میں کہ وہ اللہ کا محبوب گروہ ہیں، اس لئے جنت ان کا حق ہے، کوئی اصولی فرق نہیں رہ جاتا۔ جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے اس نے نہ صرف یہود کے اس دعویٰ کی تردید ہے بلکہ یہ اصل الاصول بھی بیان کیا ہے کہ ملت خواہ کوئی ہو، مسلمان، یہود، نصاریٰ یا صابی۔ خدا کے ہاں فیصلہ ان کے ایمان باللہ، ایمان بالآخرہ اور عمل صالح کی بنیاد پر ہوگا۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندے کے لئے اصل مطلوب توحید کا محض علم نہیں بلکہ اس کے تقاضے ہیں۔ یہ علم تو ایک نقطۂ آغاز فراہم کرتا ہے ان اعمال کا جن سے عہدہ برآمد ہو کر آدمی اللہ کے حقوق کو ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کیا ہے فرمایا۔

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ (۱۴۔ طٰہٰ)

میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں تو تو میری عبادت کر اور میری یاد کیلئے نماز کا اہتمام کر۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ (۳۴۔ حج)

تمہارا معبود ایک معبود ہے پس اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو اور بشارت دو خدا کے آگے فروتنی کرنے والوں کو۔

هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (۶۵۔ غافر)

وہ زندہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم اس کو پکارو اطاعت کو اس کے لئے خالص کرکے۔

ان آیات سے یہ مضمون بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ کلمۂ توحید کے اقرار کے بعد اصل مطلوب خدا کی عبادت، اس کی یاد، اس کے لئے فرمانبرداری اور مخلصانہ اطاعت ہے۔ ظاہر ہے کہ محض قولی شہادت اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جن لوگوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے ان کے لئے اس ایمان کی قید لگائی گئی ہے جو نیک اعمال کا بدرقہ لئے ہوئے ہو۔ کہیں بھی اعمال صالحہ کو نظر انداز کرکے محض دعوائے ایمان پر جنت کی بشارت نہیں دی گئی۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ (۴۰۔ غافر)

جس نے نیک عمل کئے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت لیکن ہو وہ مومن، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔

بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ (۲۵۔ بقرہ)

ان لوگوں کو بشارت دے دو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ ان کے لئے جنت کے باغ ہوں گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ (۹۔ مائدہ)

اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہوگا۔

زیر بحث حدیث میں موجود اس اندیشہ کے باعث کہ عامۃ الناس اس کا غلط مفہوم لے کر زندگی میں بے عملی کا فلسفہ اپنا لیں گے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی عام روایت سے روکا اور خود صحابہ کرام نے بھی اس کو پھیلانے کے معاملہ میں سخت احتیاط سے کام لیا۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ معاذ بن جبلؓ (جو ایک جلیل القدر اور فقیہہ صحابی تھے) ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں پکارا "معاذؓ!" انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ میں حاضر ہوں اور تابعدار۔ آپ نے وقفوں سے تین مرتبہ انہیں پکارا اور معاذؓ نے یہی جواب دیا۔ جب وہ حضورؐ کے ارشاد کے لئے ہمہ تن گوش ہو گئے تو آپ نے فرمایا، جو بندہ یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں تو اللہ اسے آتشِ دوزخ پر حرام کر دے گا۔ معاذؓ نے اجازت طلب کی "یا رسول اللہ کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنا دوں؟" آپ نے فرمایا: "نہیں اگر ایسا ہوا تو لوگ اسی پر تکیہ کر لیں گے۔ حضرت معاذؓ نے اس واقعہ کو راز رکھا اور اپنے مرض الموت میں اس کا انکشاف کیا۔ اوپر حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی بیان کردہ جو حدیث گزری ہے اس کی روایت انہوں نے بھی اپنے مرض الموت میں ایک شاگرد سے کی۔

اسی طرح ایک موقع پر ابو ہریرہؓ چند اکابر صحابہ کے ہمراہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بنی نجار کے باغ میں جا رہے تھے۔ انہوں نے سبقت کرکے ہمراہیوں سے پہلے آنحضرتؐ سے ملاقات کر لی۔ آپ نے احوال پوچھنے کے بعد ابو ہریرہؓ کو حکم دیا کہ ان جاں نثار صحابہ کو خوشخبری دے دیں کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دل کے یقین کے ساتھ دے گا اس کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ ابو ہریرہؓ باغ سے نکلے تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے ان کی ملاقات ہوئی۔ جب انہیں خوشخبری دی گئی تو انہوں نے ابو ہریرہؓ کو وہیں روک لیا اور ان کو واپس آنحضرتؐ کی خدمت میں لے آئے۔ یہ تحقیق کرنے کے بعد کہ واقعی آنحضرتؐ نے یہ بشارت دینے کا حکم دیا تھا حضرت عمرؓ نے درخواست کی کہ حضورؐ اس بشارت کو رکوا دیں۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس پر تکیہ کرکے عمل سے غفلت برتیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے ابو ہریرہؓ کو روک دیا۔

ایک صحابی محمود بن الربیعؓ راوی ہیں کہ انہوں نے بدری صحابی حضرت عتبانؓ بن مالک سے یہ حدیث سنی کہ ایسا شخص دوزخ کی آگ پر حرام ہوگا جس نے لا الٰہ الا اللہ پڑھا اور اس سے اس

کا مقصود اللہ کی رضا تھی۔ انہوں نے یہ حدیث قسطنطینہ پر حملہ آور ہونے والے اس لشکر کے بعض شرکاء کو سنائی، جو ۴۹ھ میں یزیدؓ بن معاویہؓ کی سرکردگی میں اس مہم پر گیا تھا اور اس میں بڑی تعداد میں صحابہ شریک ہوئے تھے۔ سامعین میں قدیم الاسلام بزرگ صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی تھے۔ انہوں نے حدیث سنتے ہی کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ آنحضرتؐ نے وہ کچھ فرمایا ہوگا جو تم بیان کر رہے ہو۔ محمودؓ پر یہ بات نہایت شاق گزری اور انہوں نے مہم سے واپسی پر پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ میں حضرت عتبانؓ سے مل کر دوبارہ حدیث کے الفاظ کے بارے میں تسلی کی۔

امام مسلم نے محمود بن الربیعؓ کی روایت لینے کے بعد ان کے شاگرد اور جلیل القدر امام حدیث زہریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ثم نزلت بعد ذلک فرائض وامور نری ان الامر انتھیٰ الیھا فمن استطاع ان لا یغتر فلا یغتر (اس کے بعد دین کے کتنے فرائض و واجبات نازل ہوتے ثواب نجات کا معاملہ ان پر منحصر ہے لہٰذا جس شخص کے بس میں ہو کہ ان کو پورا کر کے حدیث کے ظاہر الفاظ سے دھوکا نہ کھائے تو وہ ضرور ایسا کرے) اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعد کے اخیار امت نے بھی اس خطرہ سے لوگوں کو آگاہ کیا جو اس مضمون کی مجمل روایات سے لوگوں کو پیش آسکتا ہے اور امام مسلمؒ نے اس تاثر کو اپنی کتاب کے قارئین تک پہنچانا ضروری سمجھا۔

ان روایات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قدیم الاسلام اور ذکیؒ فہیم صحابہ کے سامنے اس مضمون کو بیان کر دیا لیکن عامۃ المسلمین میں اس کو پھیلانا خلاف مصلحت سمجھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عوام اس طرح کی خبر کو اس کے ظاہری پہلو کے لحاظ سے قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اس کا وہ مفہوم تو اخذ کر لیتے ہیں جو نسبتاً آسان اور دل خوش کن ہو لیکن اس کے ساتھ جو فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہیں۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ اگر یہ روایت عوام میں پھیلی تو وہ شریعت کے اعمال سے غفلت برتیں گے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس حدیث کے الفاظ سے غلط فہمی پھیلنے کے اس قدر زیادہ امکانات تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر اس کو بیان ہی کیوں کیا؟ کیوں نہ امت کو عمل کے لئے چھوڑ دیا؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس ارشاد سے آنحضرتؐ ایک تو دین میں توحید کے مقام اور اس کی اہمیت کو واضح فرمانا چاہتے تھے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ جنت کو جانے والا سیدھا

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

جاوید احمد

رجم کی سزا — روایات کی روشنی میں

(یہ مضمون رجم کی بحث کی وضاحت کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی کے ایما سے لکھا گیا)

جرم زنا کی سزا کے بارے میں سورۂ نور کی آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور: ۲) کی تفسیر کرتے ہوئے تدبر قرآن میں رجم سے متعلق اپنا جو نقطۂ نظر ہم نے بیان کیا ہے، اس کے ذیل میں اگرچہ ایک اجمالی تبصرہ بعض اُن روایاتِ حدیث پر بھی ہو گیا ہے، جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، لیکن وہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں تھی، اس لیے محسوس ہوا کہ بحث کے بعض مقدمات کی وضاحت کے لیے اس سلسلہ کی روایات مختصر توضیحات کے ساتھ اس مضمون میں جمع کر دی جائیں۔ ہمیں توقع ہے کہ جو لوگ دیانتداری کے ساتھ ہمارے استدلال کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا چاہیں گے، وہ اس وضاحت سے ان شاء اللہ بخوبی سمجھ جائیں گے۔

۱۔ رجم کا مأخذ مائدہ کی آیت محاربہ ہے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جرم زنا کی سزا کے نفاذ کے بارے میں جو روایات حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس جرم کے مرتکبین میں سے بعض کو رجم کی سزا دی ہے اور بعض کو سو کوڑے اور جلا وطنی (نفی) کی محض سو کوڑے کی سزا کا تذکرہ عہدِ رسالت میں رجم کے واقعات سے متعلق کسی روایت میں بھی نہیں ملتا۔ اس وجہ سے یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ زنا کے جرم میں سو کوڑے کی سزا اگر سورۂ نور کی آیۂ جلد کے تحت دی گئی تو اس کے ساتھ نفی کی اس سزا کا مأخذ کیا ہے؟ اس سوال کی تحقیق کے لیے جب ہم قرآنِ مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں اس کے بین الدفتین صرف ایک ہی مقام پر اس سزا کا تذکرہ ملتا ہے اور وہ سورۂ مائدہ کی آیت محاربہ ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ یہ ہیں:

إِنَّمَا جَزَآؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے
وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُّقَتَّلُوْٓا أَوْ	ہیں اور زمین میں اس لیے سرگرم ہیں کہ فساد برپا کریں ان
يُصَلَّبُوْٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ	کی سزا تو بس یہ ہے کہ عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیئے

خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ (مائدہ ۵: ۳۳)

جائیں یا سُولی پر لٹکائے جائیں یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ ملک بدر کر دیئے جائیں۔"

اس آیت کی روشنی میں جُرم زنا کی سزا کے بارے میں روایات پر غور کیجیے تو یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں زنا کے جو مُجرم حکومت کی گرفت میں آتے وہ محض زنا ہی کے مجرم نہیں تھے بلکہ اس کے ساتھ فساد فی الارض اور مُحاربہ کے مُجرم بھی تھے۔ اُن میں سے بعض کے شر و فساد کی تفصیلات اگرچہ حدیث کی کتابوں میں بیان نہیں ہوئیں، لیکن نفی کی یہ سزا اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اُن کے جُرم کی نوعیت یہی تھی۔ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت میں اس جُرم کی چار سزائیں بیان ہوئی ہیں، اور اُسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی نوعیت اور فساد کے اثرات کے لحاظ سے حکومت ان میں سے جو سزا بھی مناسب سمجھے، دے سکتی ہے چنانچہ تدبّر کی نگاہ سے دیکھیے تو یہ بات بالبداہت ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے اگر ایسے مُجرموں کو جو اپنے حالات کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق تھے، زنا کے جُرم میں آیۂ جلد کے تحت سَو کوڑے اور اُن کی سرکشی اور بدقماشی کی پاداش میں آیۂ مُحاربہ کے تحت نفی یعنی جلاوطنی کی سزا دی، تو زنا اور بدقماشی کے وہ مُجرم جنہیں کوئی رعایت دینا ممکن نہیں تھا مائدہ کی اسی آیت کے تحت ان جرائم کی انتہائی سزا یعنی "تقتیل" کے مستحق قرار پائے۔ "تقتیل" ہی کی ایک صورت رجم ہے۔ یہ لفظ، جیسا کہ ہم نے آیت کی تفسیر میں وضاحت کی ہے، چونکہ عبرت ناک اور سبق آموز طریقے پر قتل کرنے کے معنی میں آتا ہے، اس وجہ سے "رجم" کی ہولناک سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔

رہی یہ بات کہ آپؐ نے رجم کے ساتھ زنا کے جُرم میں سَو کوڑے کی سزا کیوں نہیں دی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کی سزا کے ساتھ کسی اور سزا کا جمع کرنا قانونی اخلاقیات کے منافی ہے۔ یہ اسلامی شریعت ہی نہیں، دُنیا کے تمام قوانین کا مُسلّمہ اصول ہے کہ حبس، تازیانہ، جُرمانہ، ان سب سزاؤں میں چونکہ معاشرے کی عبرت کے ساتھ آئندہ کے لیے مُجرم کی تادیب و تنبیہ کا پہلو بھی ملحوظ ہوتا ہے، اور موت کی صورت میں یہ تنبیہ اور تادیب بے معنی ہو جاتی ہے اس وجہ سے جب مختلف جرائم میں کسی شخص کو سزا دینا مقصود ہو اور ان میں سے کسی جُرم کی سزا موت بھی ہو، تو باقی سزائیں خود بخود کالعدم ہو جاتی ہیں۔

عہدِ رسالت میں رجم کے جو واقعات پیش آئے ان کی اس مخصوص نوعیت ہی کے پیشِ نظر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی الجامع الصحیح میں انہیں مائدہ کی آیتِ مُحاربہ کے تحت لیا ہے، اور اسی کتاب المُحاربین کے ایک باب میں وہ ایک روایت بھی لاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَلَف میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو رجم کی سزا کا ماخذ مائدہ کی اسی آیت کو سمجھتے تھے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنا الشيباني سألتُ عبد الله بن ابي اوفیٰ عن الرجم، فقال: رجم النبي صلّى الله عليه وسلّم فقلتُ: اقبل النّور ام بعده، قال لا ادري۔ تابعه علي بن مسهر وخالد بن عبد الله والمحاربي وعبيدة بن حميد عن الشيباني، وقال بعضهم المائدة، والاوّل اصحّ۔

"شیبانی نے ہم سے بیان کیا کہ میں نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے رجم کے بارے میں پُوچھا تو انہوں نے کہا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے رجم کیا ہے۔" میں نے پُوچھا: "کیا نُور سے پہلے یا اُس کے بعد" تو انہوں نے فرمایا: "مجھے نہیں معلوم۔" شیبانی سے اس روایت کی متابعت علی بن مسہر، خالد بن عبداللہ، المحاربی اور عُبیدہ بن حمید نے بھی کی ہے اور بعض نے نُور کے بجائے مائدہ کا ذکر کیا ہے، اور پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔"

حافظ ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ 'بعضہم' سے مُراد 'عُبیدہ' ہیں۔ ہم نے یہ روایت محض یہ دکھانے کے لیے نقل کی ہے کہ رجم کے ماخذ کی تلاش میں اَسلاف میں سے بھی بعض لوگوں کی توجہ مائدہ کی طرف گئی ہے۔ اس وجہ سے روایت کے آخر میں "اور پہلی بات (یعنی نُور کا حوالہ) زیادہ صحیح ہے" کے الفاظ سے ہمارے مَوقف پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ جو بات عام رائے کے خلاف ہو، اُسے ہمارے ہاں کم ہی شرفِ قبول حاصل ہُوا ہے۔ کتنی ہی روایات ہیں جو ہمارے اربابِ تفسیر کے ہاں کچھ زیادہ مقبول نہیں ہو سکیں لیکن غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ، تالیفِ کلام اور سیاق و سباق کے عین مطابق ہیں۔ اس روایت میں بھی ہمارے نزدیک جن بزرگ نے سزائے رجم کا مظنّہ مائدہ کو قرار دیا ہے، قرآن مجید سے مطابقت کی بنا پر، جیسا کہ آیتِ مُحاربہ اور آیتِ جَلد کی تفسیر میں ہم نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے، اُن ہی کی بات صحیح ہے۔

۲ - ماعز بن مالک کے جُرم کی نوعیت

سورۂ نُور کی تفسیر میں ماعز بن مالک کے واقعۂ رجم پر تبصرہ کرتے ہُوئے ہم نے لکھا ہے:

"اس شخص کے بارے میں کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں، اُن میں نہایت عجیب قسم کا تناقض ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا بھلا مانس تھا اور بعض سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت بدخصلت گُنڈا تھا۔ میری رہنمائی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجم کی سزا دلوائی، اس وجہ سے مَیں ان روایات کو ترجیح دیتا ہُوں جن سے اس کا وہ کردار سامنے آتا ہے جس کی بنا پر یہ مستحقِ رجم ٹھہرا۔"

متضاد روایات میں ہماری یہ ترجیح قرآنِ مجید، عُبادہ بن صامت کی حدیثِ مرفوع اور احادیث کی بعض دوسری تصریحات کے عین مطابق ہے۔ اس سے قرآن کے احکام اور سُنت کی تشریحات میں نہایت عمدہ موافقت پیدا ہو جاتی ہے اور آیۂ جلد کے بارے میں اس طرح کی کسی تخصیص و تحدید کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جس کے قرآن پہلے سے کلام میں موجود نہ ہو۔

آیۂ جلد کی تفسیر میں جہاں ہم نے اپنے یہ وجوہِ ترجیح بیان کیے ہیں، وہاں اُن روایات کا خلاصہ بھی بیان کر دیا ہے جن سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ہم وہ تمام روایات اُن کے اصل الفاظ میں نقل کر رہے ہیں، تاکہ حسبِ ذیل تین اُمور بالکل واضح ہو کر سامنے آ جائیں:

ایک یہ کہ ماعز نے بھلے مانسوں کی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے جُرم کا اقرار نہیں کیا تھا، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بلکہ دوسری روایات سے واضح ہے کہ وہ اپنے قبیلہ والوں کے اِصرار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں، اس توقع پر آیا کہ خود حاضر ہو جانے سے غالباً وہ کسی بڑی سزا سے بچ جائے گا۔ حضورؐ کو اس کے جُرم کی اطلاع پہلے سے مل چکی تھی اور اس نے آپ کی پوچھ گچھ کے نتیجے میں اقرارِ جُرم کیا۔

دُوسرے یہ کہ اس کا کردار ایک نہایت بدخصلت گُنڈے کا کردار تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کسی غزوہ کے لیے نکلتے تو مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھا کر یہ جنس زدہ بدمعاشوں کی طرح عورتوں کا تعاقب کرتا۔

تیسرے یہ کہ بعض روایات میں اگر اس کی توبہ و انابت کا ذکر ہے تو ساتھ ہی دوسری روایات میں اس بات کا ذکر بھی بالصراحت ہُوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ اس کی مغفرت کے لیے دُعا کی، نہ اس کا جنازہ پڑھا جو اس بات کی شہادت ہے کہ اس کو کم از کم منافق قرار دیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپؐ نے اس کے بارے میں بعض لوگوں کو کفِ لسان کی ہدایت فرمائی، لیکن ان کا عام تاثر یہ تھا کہ اس شخص کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ یہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

روایات یہ ہیں:

(ا) ۔۔۔۔ قال یا ابن اخی، انا اعلم الناس بھذا الحدیث، کنت فیمن رجم الرجل، انّا لما خرجنا بہ فرجمنا ہ فوجد مس الحجارۃ، صرخ بنا: یا قوم ردّونی الی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم، فان قومی قتلونی وغرّونی من نفسی و اخبرونی ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم غیر قاتلی، فلم ننزع عنہ حتّٰی قتلناہ، فلمّا رجعنا الی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم و اخبرناہ قال: "فھلّا ترکتموہ وجئتمونی بہ" لیستثبت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم منہ، فاما لترک الحد فلا، قال فعرفت وجہ الحدیث۔ (ابوداؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)

جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بھتیجے! میں سب لوگوں سے زیادہ اس بات سے واقف ہُوں۔ میں اُن لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اس شخص کو رجم کیا۔ واقعہ یُوں ہے کہ ہم نے اسے باہر لا کر سنگسار کرنا شروع کیا، پتھر پڑے تو وہ چیخا: "لوگو! مجھے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس لے چلو۔ میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ انہوں نے مجھے دھوکے میں رکھا۔ وہ مجھے یہی کہتے رہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل نہیں کرائیں گے۔" لیکن ہم نے اسے قتل کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ پس جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹے اور آپ کو اس کی اس جزع فزع کے بارے میں بتایا تو آپ نے فرمایا: "تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، تم اسے میرے پاس کیوں نہیں لائے؟" یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ آپ حقیقت معلوم کر سکیں۔ آپ نے یہ بات حد ساقط کرنے کے لیے نہیں فرمائی تھی۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد یہ حدیث میری سمجھ میں آ گئی۔

عن ابن عباس انّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلم قال لماعز بن مالک: احق ما بلغنی عنک؟ قال: وما بلغک عنّی؟ قال: بلغنی انک وقعت بجاریۃ آل فلان، قال: نعم، قال: فشھد اربع شھادات ثم امر بہ فرُجم۔ (صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من

"ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز سے پُوچھا: "مجھے تمہارے بارے میں جو کچھ معلوم ہُوا ہے کیا وہ درست ہے؟" اس نے کہا: "آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم ہُوا ہے؟" آپ نے فرمایا: "مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تم نے فلاں قبیلہ کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کی ہے۔" اُس نے کہا: "ہاں"۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اُس نے چار مرتبہ اقرار کیا، تب آپ کے

اعترف علی نفسہ بالزنا)

(ب) عن جابر بن سمرة قال: رأیت ماعز بن مالک حین جئ بہ الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلاً قصیراً اعضل لیس علیہ رداء فشھد علی نفسہ اربع مرات انہ قد زنیٰ۔ (صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنا)

... قال: لا واللہ، انہ قد زنی الأخر۔ قال: رجمہ ثم خطب فقال: الا کلما نفرنا فی سبیل اللہ عز وجل خلف احدھم لہ نبیب کنبیب التیس یمنح احداھن الکثبة اما، ان اللہ ان یمکنی من احد منھم الا نکلتہ عنھن۔ (ابو داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)

حد نافذ کرنے کا حکم دیا گیا پس اسے سنگسار کر دیا گیا۔"

جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ماعز کو جب اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، دیکھا کہ وہ ایک مضبوط پٹھوں والا چھوٹے قد کا آدمی ہے اس نے کوئی چادر نہیں اوڑھ رکھی تھی پس اُس نے چار مرتبہ اقرار کیا کہ اُس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔

"ماعز نے اقرار کیا: "نہیں، بخدا اس مجرم نے فی الواقع زنا کیا ہے۔" راوی بیان کرتے ہیں کہ حضور نے اسے رجم کرا دیا پھر خطبہ دیا: خبردار! جب کبھی ہم اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلتے تھے تو ان میں سے ایک ایسا شخص پیچھے رہ جاتا تھا جو شہوت ہیجان میں بکرے کی طرح ممیاتا اور کسی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا تھا خبردار اس طرح کا کوئی شخص میری گرفت میں آ گیا تو میں اسے ان عورتوں سے دور کرنے کے لیے عبرت ناک سزا دوں گا۔"

(ج) .... فرمیناہ بجلامید الحرة (یعنی الحجارة) حتی سکت، قال: ثم قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطیباً من العشی، فقال: اوکلما انطلقنا غزاة فی سبیل اللہ، تخلف رجل فی عیالنا لہ نبیب کنبیب التیس، علی ان لا اوتی برجل فعل ذلک الا نکلت بہ، قال: فما

"پس ہم نے اُسے وادی حرہ کے پتھروں سے مارا یہاں تک کہ وہ ختم ہو گیا۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ اُسی دن عصر کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا: کیا ایسا نہیں ہوتا تھا کہ جب کبھی ہم جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکلتے تھے تو ایک ایسا شخص پیچھے ہمارے اہل و عیال میں رہ جاتا تھا جو شہوت کے جوش میں بکرے کی طرح ممیاتا تھا۔ سنو مجھ پر لازم ہے کہ اس طرح کی حرکتیں کرنے والا کوئی شخص میرے پاس لایا جائے

استغفرلہ ولا سبہ۔ (صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنا)

عن ابن عباس ان ماعز بن مالک اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، فقال: انہ زنیٰ فاعرض عنہ، فاعاد علیہ، مراراً، فاعرض عنہ، فسأل قومہ: "أمجنون ھو؟" قالوا: لیس بہ بأس، قال: "أفعلت بھا؟" قال نعم، فامر بہ ان یرجم، فانطلق بہ فرجم، ولم یصل علیہ۔ (ابو داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)

"... فامر بہ فرجم فکان الناس فیہ فرقتین؛ قائل یقول: لقد ھلک لقد احاطت بہ خطیئتہ۔ ... (صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسہ بالزنا)

"... فامر بہ فرجم، فسمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجلین من اصحابہ یقول احدھما لصاحبہ: انظر الی ھذا الذی ستر اللہ علیہ فلم تدعہ نفسہ حتی رجم رجم الکلب۔ (ابو داؤد، کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالک)

تو میں اُسے عبرت ناک سزا دوں، راوی بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اُسے بُرا بھلا کہا نہ اس کے لیے مغفرت کی دُعا کی۔"

"ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ماعز بن مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو اُس نے اقرار کیا کہ اُس نے زنا کیا ہے۔ آپ نے اعراض کیا تو اُس نے اپنا یہ اقرار کئی مرتبہ دہرایا اس پر بھی آپ متامل رہے، پھر آپ نے اُس کی قوم کے لوگوں سے پوچھا: "کیا یہ پاگل ہے؟" انہوں نے کہا: "نہیں بھلا چنگا ہے۔" آپ نے اس سے پوچھا: "کیا تم نے واقعی اُس شخص سے بدکاری کی ہے؟" اُس نے کہا "ہاں" پس آپ نے حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے چنانچہ اُسے لے جایا گیا اور رجم کر دیا گیا اور اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔"

"آپ نے ماعز پر حد نافذ کی، پس اُسے رجم کر دیا گیا تو لوگ اس کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں ایک کی رائے تھی کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا یہاں تک کہ یہ ہلاک ہو گیا۔"

"پس آپ نے ماعز کے بارے میں حکم دیا تو اُسے رجم کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں سے دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے یہ کہتے ہوئے سنا: اس بدبخت کو دیکھو، اللہ نے اس کا پردہ ڈھانکے رکھا تھا لیکن اس کے نفس نے اس کو نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگسار کر دیا گیا۔"

۳۔زنا بالجبر کے مجرم کو رجم کی سزا

زنا بالجبر کا جرم بھی چونکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے حرابہ اور فساد فی الارض ہی کے قبیل سے ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مرتکب کو، مجرد زنا کی سزا یعنی سو کوڑے کے بجائے مائدہ کی آیت محاربہ کے تحت رجم ہی کی سزا دی ہے۔ اس مقدمہ میں مجرم، نماز کے لیے جاتی ہوئی ایک خاتون پر سرِ راہ حملہ آور ہونے کی وجہ سے، چونکہ کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا، اس لیے آپ نے اس کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کے بارے میں بھی کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔ حدیث میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

"عن علقمة بن وائل عن ابيه، ان امرأة خرجت على عهد النبي صلى الله عليه وسلم تريد الصلوة، فتلقاها رجل، فتجللها، فقضى حاجته منها، فصاحت، وانطلق، فمر عليها رجل، فقالت: "ان ذاك فعل بي كذا وكذا"، ومرت عصابة من المهاجرين، فقالت: "ان ذلك الرجل فعل بي كذا وكذا"، فانطلقوا، فاخذوا الرجل الذي ظنت انه وقع عليها فاتوها به، فقالت: "نعم هو هذا"، فاتوا به النبي صلى الله عليه وسلم، فلما امر به قام صاحبها الذي وقع عليها، فقال: "يا رسول الله، انا صاحبها"، فقال لها: "اذهبي فقد غفر الله لك"، وقال للرجل قولاً حسناً (قال ابو داؤد: يعني الرجل المأخوذ) وقال للرجل الذي وقع عليها: "ارجموه"۔

(ابو داؤد، کتاب الحدود، باب فی صاحب الحد یجئ فیقر، والترمذی، ابواب الحدود)

"علقمہ بن وائل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک عورت نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلی تو راستے میں ایک شخص نے اُسے دیکھا پس اُس نے اس پر غلبہ پالیا اور اپنے نفس کی پیاس بجھائی۔ اس پر وہ چیخی چلائی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک آدمی کا گزر اس طرف سے ہوا تو اس عورت نے اسے بتایا کہ ایک شخص نے اس طرح اُسے رُسوا کیا ہے۔ یہ بات ہو رہی تھی کہ مہاجرین میں سے ایک گروہ بھی اس طرف آنکلا۔ اس نے انہیں بھی اپنی روداد سنائی تو وہ بھاگے اور اُس شخص کو پکڑ لیا جس کے بارے میں اس عورت کا خیال تھا کہ اس نے اس سے زیادتی کی ہے۔ پس وہ اسے اُس کے پاس لے آئے تو اُس نے کہا: "ہاں، یہ وہی ہے۔" چنانچہ وہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے تو آپ نے جب اُس کے سزا دینے کا حکم دے دیا، یہ دیکھ کر اصل مجرم کھڑا ہو گیا اور اُس نے کہا: "اے اللہ کے رسول، یہ میں تھا جس نے اس عورت سے زیادتی کی۔" اس پر آپ نے اس عورت سے کہا: "جا، اللہ نے تجھے معاف کر دیا۔" اور اُس شخص سے بھی کلمات خیر فرمائے جو شبہ میں پکڑا گیا تھا۔ پھر اس شخص کے بارے میں جس نے اس عورت سے بدکاری کی تھی فرمایا: "اسے رجم کر دو۔"

۴۔غامدیہ کا واقعۂ رجم اور بعض حقائق

ماعز بن مالک اسلمی کے بعد دوسرا بڑا واقعہ غامدیہ کا ہے، جو قبیلۂ غامد (قبیلۂ جُہَینہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اس کے بارے میں روایات میں جو تفصیلات ملتی ہیں اُن سے نہ اُس کے کردار کے بارے میں کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں نہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شادی شدہ تھی۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اس کو رجم کی سزا دی، اسی وجہ سے آیتِ جلد کی تفسیر میں بیان کیے گئے دلائل اور ماعز کے معاملے کی تفصیلات کی روشنی میں ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کے واقعہ کی نوعیت بھی وہی ہے جو ماعز کے واقعہ کی ہے۔ تھوڑی بہت تفصیلات جو بیان ہوئی ہیں ان میں ماعز کے واقعہ ہی کی طرح بہت سے اُمور باہم متناقض ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع میں اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن یہ اپنے اقرار پر مُصر رہی تو آپ نے فرمایا: "اچھا نہیں مانتی تو جا، وضعِ حمل کے بعد آیئو۔" حمل سے فارغ ہو کر بچے کے ساتھ آئی تو آپ نے فرمایا: "جا اور اس کو دودھ پلا، دودھ چھڑانے کے بعد آیئو۔" پھر وہ دودھ چھڑانے کے بعد آئی تو اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جو اُس نے بچے کو کھلا کر حضورؐ کو دکھایا۔ تب آپ نے اس کے رجم کا حکم صادر فرمایا۔ اس کے برعکس بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اقرار کیا تو آپ نے اسے وضعِ حمل تک ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ وضعِ حمل کے بعد اُس نے اطلاع دی تو آپ نے فرمایا: "اسے اس حالت میں رجم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے چھوٹے بچے کو کوئی دودھ پلانے والا بھی نہیں۔" اس پر انصار میں سے ایک صاحب کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا: "اس کی رضاعت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔" اس کے بعد آپ نے بغیر کسی توقف کے اس کے رجم کا حکم دے دیا۔

روایات کے مطالعہ سے بیان کا یہ تناقض ہی سامنے نہیں آتا، یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ کوئی آزاد قسم کی عورت تھی جس کا کوئی شوہر تھا نہ سرپرست جو اس کے کسی معاملے کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے تیار ہوتا۔ وضعِ حمل تک کی مدت اس نے ایک انصاری کے ہاں گزاری، اس کے اقرار سے لے کر سزا کے نفاذ تک کسی موقع پر بھی اس کے خاندان یا قبیلہ کا کوئی آدمی مقدمہ کی کارروائی کے سلسلے میں سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس ماعز کے معاملہ میں، اگرچہ وہ ایک یتیم لڑکا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ قبیلۂ اسلم میں اس کے سرپرست ہر جگہ

اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ واقعات کی اس مخصوص نوعیت ہی کے پیشِ نظر ہم نے آیۂ جلد کی تفسیر میں لکھا ہے:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رجم کے ایک آدھ اور واقعات جو پیش آئے، اُن کی تفصیلات روایات میں نہیں ملتیں بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودیوں کو اور بعض عورتوں کو آپ نے رجم کرایا۔ اگر ان کے مقدمات کی صحیح نوعیت معلوم ہو سکتی تو ان شاء اللہ یہ بات واضح ہو جاتی کہ ان کے واقعات کی نوعیت بھی وہی ہے جو ماعز کے واقعہ کی ہے۔"

○

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رجم کی سزا کے جو واقعات احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، وہ عام قسم کے زانیوں کے واقعات نہیں ہیں، بلکہ اُن بدقماشوں کے واقعات ہیں، جو اپنی آوارگی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں، کُھلم کُھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس فعلِ قبیح کو بطورِ پیشہ کے اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ اُن کی گردن تک پہنچنے ہی والے ہیں تو اس قبیل کے مجرموں کی عام نفسیات کے مطابق اعتراف و اقرار کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں تاکہ معاشرے اور قانون دونوں کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجرموں کے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کی تحقیق بھی فرمائی، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے قوانین کی طرح اسلامی شریعت کا بھی یہ مسلّمہ اصول ہے کہ حدود و تعزیرات کے نفاذ میں مجرم کے احوال کی رعایت کی جانی چاہیے۔ اس رعایت میں عمر، شادی، دماغی حالت، ماحول غرض ہر وہ چیز جو جرم کا محرک یا اس کے ارتکاب میں رکاوٹ بن سکتی ہے، عدالت کے پیشِ نظر رہے گی۔ احادیث میں ثیب و بکر کے الفاظ آتے ہیں، ان کا اطلاق عربیت کی رُو سے جس طرح شادی شدہ اور غیر شادی شدہ پر ہوتا ہے اسی طرح پختہ عمر کے آدمی اور الھڑ نوجوان پر بھی ہوتا ہے۔ ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے مجرم کی حالتوں میں سے ایک حالت کو مناطِ حکم قرار دے دیا، دراں حالیکہ اس کا کوئی تعلق مناطِ حکم سے نہیں ہے۔ اس طرح کی چیزیں تو ہر جرم کی سزا نافذ کرتے وقت ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ ھٰذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اس کی اساسات (۳)

اخلاص

عبادت ہو یا اطاعت، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان میں سے قبولیت صرف اسی عمل کو حاصل ہوتی ہے جس میں اخلاص ہو۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی حاصل کرنے کے لئے کیا جائے۔ اس مقصد کے سوا کسی اور غرض کا اس میں شائبہ نہ ہو۔

لوگوں نے اس کی تعریف اگرچہ مختلف الفاظ میں کی ہے لیکن یہ اختلاف محض الفاظ کا ہے مدعا سب کا ایک ہی ہے۔ ایک عارف نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اطاعت میں مقصود صرف اللہ وحدہٗ کی ذات ہو۔ ایک اور بزرگ نے فرمایا کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کو مخلوق کے خیال و لحاظ سے بالکل بالاتر رکھے۔ ایک اور عارف کا قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کے اعمال ظاہر و باطن دونوں میں بالکل یکساں ہوں۔ اسی طرح ایک اور بزرگ کا ارشاد ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ آدمی کی توجہ اس طرح خدا کی طرف ہو جائے کہ وہ اپنے عمل میں خلق کے لحاظ و خیال سے، بالا ہو جائے۔ فضیل کا قول ہے کہ لوگوں کے خیال سے عمل کو چھوڑنا ریا ہے کرنا شرک ہے، اخلاص یہ ہے کہ آدمی ان دونوں فتنوں سے محفوظ رہے[1]۔

احادیث سے بھی اخلاص کی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے:

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اُس کی نیت ہی آئے گی۔ جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے شمار ہوگی اور جس کی ہجرت کسی دنیوی مقصد کے لئے ہوگی جس کو وہ پانا

---

[1] یہ اقوال مدارج السالکین جلد ۲ ص ۹۱ سے ماخوذ ہیں۔

کرنا چاہتا ہے یا کسی عورت کی خاطر ہوگی جس سے وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لئے ہے۔" (متفق علیہ)

"ابو موسیٰ عبداللہ بن قیس اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنی بہادری کی نمائش کے لئے جنگ کرتا ہے، ایک شخص مجرد حمیت کے تحت جنگ کرتا ہے، ایک شخص محض دکھاوے کے لئے جنگ کرتا ہے، ان میں سے کس کی جنگ اللہ کی راہ میں ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کے راستہ میں اس شخص کی جنگ ہے جو اس مقصد کے لئے جنگ کرے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔" (متفق علیہ)

اسی طرح ایک اور مشہور حدیث ہے جس میں یہ خبر دی گئی ہے کہ سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی۔ ایک قرآن کے وہ قاری جو قاری کہلانے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں، دوسرے وہ مجاہد جو بہادر کہلانے کے لئے جہاد کرتے ہیں، تیسرے وہ صدقہ کرنے والے جو اس لئے صدقہ کرتے ہیں کہ لوگوں میں ان کی داد و دہش کی دھوم ہو۔

جو حقیقت ان احادیث میں واضح کی گئی ہے، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اخلاص کی یہی اہمیت و حقیقت قرآن مجید میں بھی بیان ہوئی ہے:

وَمَآ أُمِرُوْٓا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (۵ - بینہ)	اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں، اسی کے لئے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے یکسو ہو کر۔
فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۔ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ (۲-۳ - زمر)	پس اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی کے لئے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ آگاہ کہ اطاعت خاص اللہ ہی کے لئے زیبا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اعلان کرایا گیا ہے:

قُلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِيْنِيْ ۔ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۱۴-۱۵ - زمر)	کہہ دو میں اللہ ہی کی بندگی کرتا ہوں اسی کے لئے دین کو خاص کرتے ہوئے پس تم اس کے سوا جس کو چاہو پوجو۔

تمام عبادت و اطاعت کی روح اسی اخلاص کو قرار دیا گیا ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۶۲ - ۱۶۳ - انعام)	کہہ دو میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لئے ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں تم میں پہلا مسلم ہوں۔

اس اخلاص کے لئے جہاں یہ بات ضروری ہے کہ آدمی کا عمل صرف اللہ کے لئے ہو وہیں یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کا عمل خدا کے حکم اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق ہو یہ چیز اخلاص کی فطرت کا لازمی تقاضا ہے اگر کوئی شخص کوئی کام نہایت اخلاص کے ساتھ خدا ہی کے لئے کرے لیکن اس کا وہ کام خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہو تو اس کا یہ اخلاص بے معنی بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے۔ اس کا طرز عمل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ خدا کی پسند و ناپسند کو خود خدا اور رسولؐ سے زیادہ سمجھنے کا زعم رکھتا ہے اور یہ زعم، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ گھمنڈ اور شرک دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے کوئی عمل جو خدا اور رسولؐ کے حکم کے خلاف ہو، وہ اخلاص کا عمل نہیں قرار پا سکتا، اگرچہ وہ کتنے ہی مخلصانہ طور پر انجام دیا جائے۔

فضیل بن عیاضؒ کا ایک قول سننے اور سمجھنے کے قابل ہے۔ ان سے بہترین عمل کی حقیقت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ بہترین عمل یہ ہے کہ وہ خالص اور بے لوث بھی ہو اور درست بھی۔ جب اس کی مزید تشریح ان سے چاہی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر عمل درست ہو لیکن خالص نہ ہو جب بھی وہ قبول نہیں ہوتا۔ خدا کے ہاں قبول ہونے کے لئے ضروری ہے کہ عمل خالص بھی ہو اور درست بھی۔ پھر انہوں نے خالص کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ صرف اللہ کے لئے ہو۔ اور درست کی یہ تشریح فرمائی کہ وہ سنت کے مطابق ہو۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں چند آیتیں پڑھیں۔

اگر کوئی عمل خدا اور رسول کے حکم کے خلاف مجرد اخلاص کی بنا پر خدا کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کر سکتا تو رہبانیت کا نظام اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور قبولیت کا درجہ پاتا اس

لئے کہ جن لوگوں نے اس نظام کو ایجاد کیا، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کے اخلاص کا حوالہ دیا ہے لیکن ان کے اس اخلاص کے حوالہ کے باوجود ان کی اس ایجاد کو بدعت اور باطل قرار دیا۔

بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر ایک آدمی بھلائی کے کام کرے لیکن وہ اللہ کے لئے نہ کرے یا اللہ کے ساتھ اس میں دوسروں کو بھی شریک کرے تو آخر اس کے وہ عمل خدا کے ہاں قبولیت سے کیوں محروم رہتے ہیں، کام تو اس کے وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ قرار دیئے گئے ہیں؟ جن لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے وہ دین کی ایک بنیادی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے اچھائی اور بھلائی کے کاموں کا محتاج نہیں ہے کہ جو لوگ بھلائی کا کوئی کام کردیں خواہ وہ اس کے لئے کریں یا کسی اور کے لئے، خواہ وہ اس عمل کو اس کے حکم کے مطابق کریں یا اس کے خلاف، وہ ان کا ممنون کرم ہو جائے کہ ان لوگوں نے اس پر یا اس کی دنیا پر کوئی احسان کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اس پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان کی بھلائیوں کی قدر کرے اور ان کا بدلہ دے۔

اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی اور بدی دونوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی ساری دنیا کو صرف فرشتوں ہی سے بھر دے، اس کے اندر کوئی برائی کرنے والا سرے سے رہ ہی نہ جائے۔ اسی طرح اگر وہ چاہے تو ہر آدمی کو اتنا نیک بنا دے کہ اس سے کسی شر کا صدور سرے سے ہو ہی نہیں لیکن اختیار اور قدرت کے باوجود اس نے ایسا نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو صرف نیکی اور بھلائی ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ لوگ بھلائی کے کام صرف اس کی رضا کے لئے کریں اور اس کے حکموں کے مطابق کریں۔ اس وجہ سے جو نیکی مذکورہ شرطوں کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی تو اس کے ہاں بڑی قدر ہے، خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو اور وہ اس کا اجر دیتا ہے لیکن جس نیکی میں کسی اور شائبہ کی ملاوٹ ہو جاتی ہے، اس کا اس کے ہاں کوئی اجر نہیں ہے، وہ اس طرح کی نیکی کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اس کا اجر اس سے لو جس کے لئے تم نے یہ نیکی کی ہے۔ احادیث میں یہی حقیقت اس طرح واضح کی گئی ہے۔ ایک حدیث قدسی ہے:

انا اغنی الشرکاء عن الشرك من عمل عملاً اشرك فيه غيري فهو للذي اشرك به وانا منه بري

میں سا جھے کے تمام شریکوں سے زیادہ بے نیاز ہوں جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ اس نے کسی دوسرے کو بھی شریک کر لیا تو وہ عمل اسی کے لئے ہو جاتا ہے جس کو اس نے میرے ساتھ شریک کیا اور میں اس سے بری ہو جاتا ہوں۔

جب آخرت میں ایسے لوگ اجر کے طالب ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ:

اذهب فجد اجرك ممن عملت له لا اجرلك عندنا

جاؤ اس سے تم اپنے عمل کا معاوضہ لو جس کے لئے تم نے یہ کام کیا ہے ہمارے ہاں تمہارے لئے کوئی اجر نہیں ہے۔

یہ شریک، کوئی بُت اور صنم بھی ہو سکتا ہے، خاندان اور قبیلہ بھی ہو سکتا ہے۔ قوم اور وطن بھی ہو سکتے ہیں، شہرت، دکھاوے اور نفس کی دوسری خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے جو چیز بھی ہو وہ اخلاص کی ضد ہے اور وہ انسان کے عمل کو عنداللہ باطل کر دیتی ہے۔

اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ کوئی مخلص مسلمان اپنے خاندان یا قبیلہ، قوم اور وطن کے لئے کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلہ، قوم اور وطن کے حقوق و فرائض خود نہایت تفصیل کے ساتھ متعین کر دیئے ہیں اور ہر مسلمان پر یہ واجب کر دیا ہے کہ ہر شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لئے اور اس کے حکموں کے مطابق ادا کرے، جو شخص ان حقوق و فرائض کو اللہ کی رضا کے لئے اور اس کے احکام کے مطابق ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بڑا اجر ہے اور اس کا وہ کام عبادت میں شمار ہوتا ہے اگرچہ وہ بیوی کے منہ میں لقمہ ہی ڈالنا کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ کام خدا کے لئے نہ ہو تو وہ نری دنیاداری ہے اگرچہ وہ، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، بظاہر جہاد ہی کیوں نہ ہو۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس اخلاص کے ہونے یا نہ ہونے سے عمل کی فطرت میں بڑا تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے ایک ماں کی مامتا بچے کے لئے ہر شبہ سے بالاتر چیز ہے

لیکن اگر وہ اپنی ماتا کے جوش میں یہ کرے کہ بچے کی بیماری میں اس کو وہ سب کچھ کھلاتی جائے جس کے لئے بچہ ضد کرے، ڈاکٹر کی ہدایات کی وہ کوئی پروا نہ کرے تو اس ماتا کے باوجود اندیشہ ہے کہ وہ بچے کی جان لے کے رہے گی۔

اسی طرح فرض کیجئے، ایک شخص ہے جو کام تو اچھے کرتا ہے لیکن ان کاموں میں اس کے سامنے صرف خدا ہی کی رضا جوئی کا نصب العین نہیں ہے بلکہ خدا کے سوا کوئی اور نصب العین ہے تو لازمی طور پر وہی نصب العین اس کے لئے حق اور باطل پسند اور ناپسند، خیر اور شر کے لئے معیار بن جائے گا۔ آگے چل کر یہ چیز اس کی ہر بھلائی کو برائی کی شکل میں تبدیل کر دے گی۔ وہ اپنے قبیلہ اور اپنی قوم کے لئے اچھے اچھے کام کرتے کرتے بالآخر اس فلسفہ تک پہنچ سکتا ہے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو، یا باطل پر" یہ فلسفہ بالآخر اس کو ہٹلر اور مسولینی بنا دے سکتا ہے۔ یہ صرف خدا کی رضا جوئی کے نصب العین ہی کا خاصہ ہے کہ وہ انسان کو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ نصب العین انسان کو ایک جہانی اور آفاقی نقطۂ نگاہ دیتا ہے

باقی صفحہ ۴۸ پر

بقیہ : تدبر حدیث

راستہ ایک ہی ہے اور وہ توحید ہے۔ شرک کی کوئی راہ جنت تک نہیں پہنچاتی۔ توحید کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے راستے پر چل کر وہ یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ خدا کے ہاں فائز المرام ہوں گے۔ دوسرے آنحضرتؐ اس وضاحت سے اللہ کے نیک بندوں کو اطمینان دلانا چاہتے تھے کہ ان کی نیک نفسی اور خلوص اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔ دنیا کی اس چند روزہ زندگی میں اللہ کے بندوں کے سامنے اگر کوئی پریشان کن مسئلہ ہوتا ہے تو یہ کہ آخرت کی غیر فانی زندگی میں وہ کیسے سرفراز ہوں اور اپنے آپ کو دوزخ کے خطرہ سے محفوظ کر کے وہ کس طرح رب کریم کی عنایات کے سزاوار ٹھہریں۔ آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ان کو یقین دہانی کراتا ہے کہ آخرت میں وہ کامیابی سے ہمکنار ہو کر جنت میں داخل ہونے کے مستحق ٹھہریں گے بشرطیکہ وہ دنیوی زندگی میں توحید کے علمبردار رہے ہوں۔ یہ کام انہوں نے نیک نیتی سے اللہ کی رضا کے حصول کے لئے کیا ہو، وہ زندگی بھر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیتے رہے ہوں اور اسی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے حوالے کی ہو۔

مراسلہ و مذاکرہ

فراہی مکتبِ فکر کی بعض خصوصیات

امین احسن اصلاحی

مولانا فراہیؒ کے مکتبِ فکر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم پر براہِ راست غور کرنے کی راہ کھولی۔ وہ قرآن مجید کے الفاظ، اس کے نظام اور اُس کے نظائر کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ تفسیری روایات یا مفسرین کے اقوال کا درجہ اُن کے ہاں ثانوی ہے۔ جو روایات قرآن کے الفاظ، نظام اور نظائر سے موافقت رکھنے والی ہوتی ہیں اُن کو تو وہ لے لیتے ہیں جو اس وصف سے محروم ہوتی ہیں اُن کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔

کسی کلام پر غور کرنے کا فطری طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو اس کی زبان اور اس کے نظام کی روشنی میں سمجھا جائے اور اگر کہیں کوئی شبہ یا اختلاف پیدا ہو تو اس کے نظائر کی روشنی میں اسے طے کیا جائے لیکن ہمارے ہاں عرصہ دراز سے قرآن مجید پر غور کرنے کا یہ طریقہ رائج ہے کہ سارا اعتماد تفسیر کی کتابوں پر کیا جاتا ہے۔ کوئی تفسیر اٹھائیے۔ ابن عباسؓ نے یہ کہا ہے، عکرمہؒ نے یہ کہا ہے، مجاہدؒ نے یہ کہا ہے، حسنؒ سے یہ مروی ہے پھر ان میں سے کسی قول کو یا تو بلا کسی وجہ ترجیح کے لے لیا یا سب کو بلا فرق و امتیاز نقل کر دیا۔ اس سے بھی سہل طریقہ یہ ہے کہ تفسیر کی متداول کتابوں۔ ابن جریرؒ، بیضاویؒ، جلالین کی ہر بات مجرد اس دلیل کی بنا پر حق سمجھی جاتی ہے کہ وہ ان کتابوں میں نقل ہے۔

اس طریقۂ تفسیر کا اُن لوگوں پر نہایت بُرا اثر پڑا جو مجرد کتابوں پر اعتماد کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ وہ اقوال کو دلائل کی کسوٹی پر بھی پرکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہ طریقہ عقل کو مطمئن کرنے والا نہیں ہے تو انہوں نے اپنے زعم کے مطابق اپنی ایک الگ راہ نکال لی۔ انہوں نے تفسیر کی کتابوں اور قرآن کے الفاظ ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر مجرد اپنی خواہشوں کو رہنما بنایا اور قرآن کی من مانی تاویلات شروع کر دیں جس سے ملت میں ایک نیا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہماری قوم میں اس طریقۂ تفسیر کے بانی سر سید احمد خان مرحوم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے۔

اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے مولانا فراہیؒ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ قرآن کی اپنی فطری عقلیت بے نقاب کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے براہِ راست قرآن پر غور کر کے آفاق و انفس کے وہ براہین واضح کئے جن سے قرآن نے خلق پر حجت قائم کی ہے۔ یہ براہین قرآنی علم کلام

کی بنیاد ہیں اور یہ ایسے فطری ہیں کہ ہر سلیم الطبع انسان ان کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھتا ہے۔ اس قرآنی علمِ کلام کی کلید قرآن کا وہ نظام ہے جو قرآن پر تدبر کے لئے مولاناؒ کے نزدیک دوسری بنیادی چیز ہے۔

یہاں ایک امرِ واقعی کی طرف اشارہ غالباً نامناسب نہ ہوگا کہ تفسیر کے معاملہ میں مجرد رِوایات پر اعتماد کرنے کے رجحان کو سب سے زیادہ تقویت ہمارے امام ابن تیمیہؒ نے پہنچائی ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ متکلمین اپنی فاسد عقلیت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے مقابل میں قرآن کے الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کو بھی مشتبہ ٹھہراتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ اُن کی بدیہیات کے مقابل میں قرآن کی کوئی آیت کیا حجت ہو سکتی ہے جس کے الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت بھی مشتبہ ہے تو اس کا توڑ انہوں نے یہ کیا کہ تفسیر کے وہ تمام طریقے باطل قرار دے دیئے جو رِوایات پر مبنی نہ ہوں۔ یہ راہ اگرچہ انہوں نے نیک نیتی سے اختیار کی لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیر کی بنیاد تمام تر رطب و یابس رِوایات پر رہ گئی اور یہ چیز خود ایک فتنہ بن گئی۔ روایات میں غلو اس حد تک بڑھ گیا کہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کا، جو امام ابن تیمیہؒ کے اسکول کے مفسر ہیں، یہ حال ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں جگہ جگہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس آیت کے تحت جتنی روایات ہیں وہ سب مجروح ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انہی مجروح روایات میں سے کوئی روایت اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں آیت کی تفسیر بہرحال کسی روایت کے تحت کرنی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح طریقہ وہی ہے جو مولانا فراہیؒ نے اختیار فرمایا کہ پورے اہتمام سے قرآن کے الفاظ اور اس کے نظام کی پیروی کی جائے اور اس کی مشکلات میں بجائے اس کے نظائر و شواہد سے حاصل کی جائے۔ یہ اصول بالکل عقلی اور فطری ہے۔ آپ کسی کلام پر غور کریں گے تو بہرحال اس کے الفاظ، سیاق و سباق اور نظائر ہی کو دیکھیں گے۔ زبان بنیادی چیز ہے۔ مولانا اس زبان پر اعتماد کرتے ہیں جو قرآن کی زبان ہے۔ اس زمانے میں جو عربی پڑھی پڑھائی جاتی ہے وہ عجمی عربی ہے۔ مولاناؒ اس کو قرآن کے لئے سند نہیں مانتے بلکہ اس زبان کا علم ضروری سمجھتے ہیں جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔

نظم کے وہ بہت ہی شدت کے ساتھ قائل ہیں۔ ان کے نزدیک کسی کلام کے بارے میں مضبوط

لہ متکلمین میں سے امام رازیؒ نے یہ خیال اپنی تفسیر میں ظاہر کیا ہے۔

بنیاد پر اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو وہ اس کا نظام ہے۔ لیکن قرآن حکیم کے معاملے میں مصیبت یہ ہے کہ لوگ اس میں سرے سے کسی نظم کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ اس کی بے نظمی ہی کو حُسن قرار دیتے بیٹھے تھے۔ مولانا حمید الدینؒ نے نہایت محکم دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن میں نہایت اعلیٰ اور منطقی نظم ہے۔ انہوں نے جو تفسیر لکھی ہے اس میں نظم کو اس طرح کھول دیا ہے کہ کوئی معقول آدمی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انہوں نے یہ حقیقت بھی واضح فرمائی ہے کہ قرآن نے تمام اہم مسائل اتنے گوناگوں اسلوبوں سے بیان کئے ہیں کہ اگر ایک بات ایک جگہ سمجھ میں نہ آئے تو دوسری جگہ سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مولاناؒ کا نظریہ یہ ہے کہ اس طرزِ تدبر سے قرآن کی وہ حکمت سمجھ میں آتی ہے جو متکلمین اور فلاسفہ کی فاسد عقلیت کا اصل علاج ہے۔

سنّت نبوی اور دین پر غور کرنے میں بھی انہوں نے ایک مختلف لیکن نہایت محکم اور مستقیم راہ اختیار کی ہے۔ وہ اُس سنّت کو جو امّت کے عملی تواتر سے ثابت ہے، مثلاً نمازوں کی تعداد اُن کے اوقات، اُن کے طریقِ ادا، حج اور اُس کے مناسک، زکوٰۃ اور اُس کے بنیادی احکام، روزہ اور اس کے آداب و شرائط اور اس طرح کی تمام باتوں کو جو قرآن کے اجمالات کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو سکھایا اور امت نے ان کو اختیار کیا، اسی طرح واجب التعمیل مانتے ہیں جس طرح سے قرآن کے نصوص کو۔ ان کے نظریہ کو ہم اپنے لفظوں میں یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ اس طرح کی ساری چیزیں اسی طرح قابلِ اعتماد تواتر سے ثابت ہیں جس طرح قرآن ثابت ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ قرآن قولی تواتر سے ثابت ہے اور یہ چیزیں عملی تواتر سے ثابت ہیں۔ البتہ اخبارِ اُحاد کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ اُن کے رَدّ و قبول کا فیصلہ قرآن کی کسوٹی پر جانچ کر کرنا چاہیئے۔

فقہ کے بارے میں اُن کا مسلک یہ ہے کہ چاروں ائمہ کے مکاتبِ فکر کی بنیاد ان کے نزدیک کتاب و سنّت پر ہے۔ دلائل کی کسوٹی پر جانچ کر اُن کے اقوال کو راجح یا مرجوح تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اُن میں سے کسی کو نہ بالکلیہ رد کیا جا سکتا ہے اور نہ اُن میں سے کسی کے حق میں بیجا تعصب جائز ہے۔ وہ فقہیات میں فقہ اسلامی کے پیرو تھے۔ کسی خاص متعین فقہ کے تعصب میں مبتلا نہیں تھے۔ ہر مسئلہ میں وہ یہ دیکھتے کہ اس کی دلیل کیا ہے۔ اس دلیل کی روشنی میں اس کے ضعف و قوت کا فیصلہ کرتے۔ اسی طرح کلام و فلسفہ میں وہ خالص قرآنی کلام و فلسفہ کے قائل تھے۔ انہوں نے اس کے اصولؒ

مبادی متعین کر لیتے تھے اور اس کسوٹی پر پرکھ کر وہ دوسرے فلسفوں کو رد یا قبول کرتے تھے۔ اس موضوع پر انہوں نے اپنی تفسیر میں بھی بحث کی ہے اور اس پر بعض مستقل رسائل بھی تحریر فرمائے ہیں جو عربی میں ہیں۔ (مرتب : منصور الحمید)

فقہی اختلافات میں صحیح طرزِ عمل

سوال :- اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہنا کس حد تک درست ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا نام 'مسلم' رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف 'اسلام' ہی ہے ؟

جواب :- ایک شخص کا اپنے آپ کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کہنا اسی طریقے سے ہے جس طرح وہ کہہ دے کہ میں لاہوری یا دہلوی ہوں یا یہ کہ میں پٹھان یا شیخ ہوں۔ یعنی اس کی نوعیت محض ایک نسبت کی ہے۔

دین کے معاملہ میں واقعہ یہ ہے کہ اس نسبت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آدمی حنفی کیوں ہے؟ شافعی کیوں نہیں؟ یا شافعی کیوں ہے؟ مالکی کیوں نہیں ہے؟ یا مالکی کیوں ہے؟ حنبلی کیوں نہیں ہے؟ اس لئے کہ تمام ائمہ فقہا، یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ پوری امت کے امام ہیں۔ ان ائمہ کے متعلق کسی کا بھی یہ خیال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کا اصول یا طریقہ گمراہی کا اصول یا طریقہ تھا۔ ان سب کی فقہ کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے۔ سب دین کے اصولوں کو یکساں طور پر مانتے ہیں۔ ان کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اجتہاد کا اختلاف ہے۔ ایک مسئلے میں اجتہاد کرتے ہوئے، کسی کی رائے کچھ ہو گئی اور کسی کی کچھ۔ اس لئے ان کے بارے میں کوئی تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ چاہیے کہ سب کی عزت کی جائے۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی فقہ کا یکساں احترام کیا جائے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ذی علم اصحاب کو رایوں کے ماننے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، میرے نزدیک ایسے لوگوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ہر رائے کو اس کے دلائل کی بنیاد پر مانیں۔ انہیں یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ ایک معاملے میں احناف کا مذہب قوی ہے یا شوافع، مالکیہ یا حنابلہ کا۔ اور پھر قوی ترین رائے کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہوں۔ دین کا جو علم مجھے عطا ہوا ہے اس کی رو سے میں جب یہ جانتا ہوں کہ کسی مسئلہ میں مالکیہ کا مسلک زیادہ مضبوط ہے تو میں وہاں

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک نہیں مان سکتا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کی عزت میرے دل میں نہیں ہے۔ کتنے ہی مسائل ہیں کہ جن میں میں صرف امام ابو حنیفہؒ کی رائے کو مانتا ہوں، کسی اور امام کی رائے کو نہیں مانتا اور ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ ان کی رائے مجھے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اس میں اگر کوئی غلطی بھی ہو گی تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کا اجر دے گا۔ میں اپنے اس طریقے کو صحیح سمجھتا ہوں، اس لئے کہ میں اپنے علم اور عقل کے لحاظ سے مکلّف ہوں۔

جہاں تک ایک عام آدمی کا معاملہ ہے تو وہ صاحب علم نہیں ہوتا، اس لئے وہ رایوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ کسی اچھے عالم دین سے مشورہ کیا کرے۔ اگر اس کو کسی معاملے میں پوچھنا ہو تو بے دریغ پوچھے، قطع نظر اس سے کہ جس سے پوچھ رہا ہے وہ شافعی ہے کہ حنبلی۔ جس عالم دین کو دیکھے کہ وہ متقی ہے، خدا ترس ہے، راست باز ہے، مسجد کی حاضری دیتا ہے، لوگوں کے ساتھ اس کے معاملات اچھے پاکیزہ ہیں تو اس سے پوچھنا چاہیئے۔ اس تعصب میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے کہ وہ حنفی یا مالکی یا حنبلی کیوں نہیں۔ عالم کے انتخاب میں اپنی عقل سے کام لینا چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محض نمائشی قسم کا عالم تو نہیں جس پر دین کے معاملے میں اعتماد نہ کیا جا سکے۔

قرآن مجید میں یہ مضمون کئی جگہ بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن جب پیرو لوگ دوزخ میں جائیں گے تو اپنے لیڈروں سے لڑیں گے کہ ہم نے تو محض تمہاری پیروی کی اور یہاں پہنچے تو کیا تم عذاب میں حصہ بٹانے والے نہیں ہو گے؟ تو وہ کہیں گے کہ تم بھی بھگتو، ہم بھی بھگت رہے ہیں، اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ عوام کے اس عذر کو اللہ تعالیٰ ابھی قبول نہیں فرمائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عقل و فطرت انسان کو عطا کی ہے وہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ جان سکتا ہے کہ کون آدمی بھلا ہے، کون نہیں۔ اگر عقل یہ کام بھی نہیں کر سکتی تو وہ کس مصرف کی ہے۔ مان لیجیے کہ کچھ دنوں آپ کو دھوکا ہو جائے گا لیکن تجربے سے بتدریج ثابت ہو جائے گا کہ فلاں آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس کے اوپر میں اپنے دین کے معاملہ میں اعتبار کروں۔ تو پھر اس شخص سے رہنمائی حاصل کیجیے جس پر آپ کو اعتماد ہو۔ جان لیجیے کہ اتنی عقل اگر آپ کام میں نہیں لائیں گے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کا عذر مسموع نہیں ہو گا۔

جنت کی طمع کے لئے عمل

سوال :- کیا جنت کے حصول کے لیے کیا گیا عمل اللہ کی رضا کے حصول سے الگ، محرک پر مبنی ہے۔ اگر الگ ہے تو کیا اس پر جزاء نہیں ملے گی ؟

جواب :- جنت کے حصول کے لئے کیا گیا عمل اللہ کی رضا کے حصول کے تحت ہی ہو گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ، مالکِ جنت نے خود ہی اس کے حصول کی ترغیب دلائی ہے۔ اور اس کی تخلیق بھی بہرحال ہمارے لیے کی گئی ہے۔ ہم اپنے رب کے بندے ہیں ہم بے نیاز نہیں ہیں۔ ہمارا رب البتہ بے نیاز ہے۔ ہم تو بہرحال اپنے خداوند کی رضا، اس کی جنت اور اس کے انگور، اس کے سیب، لحم طیر اور ہر چیز کے محتاج ہیں۔ ہم ان سب چیزوں کے خواہش مند ہیں۔ ہمیں ہر چیز کے لئے چاہنا چاہیے شرط صرف یہ ہے کہ صرف اپنے خدا سے چاہنا چاہیے۔ یہی ہمارے اور اس کے شایانِ شان ہے۔ ہم روز اسی سے چاہتے اور اسی سے پاتے ہیں۔ یہاں بھی اسی سے چاہتے ہیں اور وہاں بھی اسی سے چاہیں گے۔

بعض لوگوں کے نزدیک جنت کی طلب خلوص کے منافی ہے اور طمعِ جنت اور خوفِ جہنم کے تحت زندگی گزارنا محض دنیادارانہ رویہ ہے۔ یہ سراسر غلط خیال ہے۔ اسے ہمارے صوفیاء نے عجمیوں سے لے لیا ہے اور اس طرح یہ مسلمانوں میں گھس آیا ہے۔ ہمارا رب ہمیں جنت کی نعمتوں کا شوق دلاتا اور جہنم کے متعلق بتاتا ہے کہ اس سے ڈرو، یہ ڈرنے کی چیز ہے تو اس وضاحت کے بعد طمعِ جنت اور خوفِ جہنم کے تحت زندگی گزارنا کیوں ایک غلط محرک قرار پائے گا؟

ہمارے لئے فلسفۂ دین کی اصل کسوٹی اور منبع کتاب وسنت ہیں۔ ان کی رو سے جنت کے حصول کے لئے یا جہنم سے بچاؤ کے لئے کیا گیا عمل اللہ کی رضا کے حصول کے تحت ہی ہے اور خدا کے ہاں اس کی جزا ملے گی۔ (مرتب : ماجد خاور)

بقیہ : تعلق باللہ اور اس کی اساسات

اور اس کی وجہ سے اس کے سامنے ہمیشہ اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہبود کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت کا ہمہ گیر پروگرام رہتا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو پسند اور ناپسند کا معیار قرار دینا حرام پایا۔ اسی حقیقت کو اخلاص کہتے ہیں۔ یہی اخلاص عقیدہ توحید کی جان اور روح ہے اور یہ عقیدہ (توحید) تعلق باللہ کا بنیادی پتھر ہے۔